امامِ وقت کا
قاتل کون

خلیفانہ جرائم کی تاریخ کے ایک گمشدہ باب کی بازیابی

قاتل کون؟

ہامون؟ یا مامون؟

تاریخ کے صحرا میں امامِ وقت
کے اس قاتل کی تلاش
جو مورخین کی تحریروں میں
کہیں گم ہے

سرکار زینبی جارچوی

نام کتاب — "قاتل کون؟"

مصنف — سرکار زینی جلالپوری

معاون طباعت — سید ظہور مصطفےٰ رضوی

سن اشاعت — فروری ۱۹۹۱ء

تعداد — ۵۰۰

مطبوعہ

قیمت

ادارۂ "بلغ ما انزل" ناظم آباد کراچی

ملنے کا پتہ

"اردو محل" ۲۴/۵-سی ۵ ناظم آباد کراچی۔ فون: 610148

شہادتِ مستور

خدائے تعالیٰ نے خطاب بالوحی کے ذریعہ انسان سے کہا تھا کہ "جب تم حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر ہو تو حق کو باطل سے خلط ملط نہ کرو اور نہ ہی حق کو چھپانے میں کوشاں رہو (بقرہ: ۴۲) لیکن اسی انسان نے اس حکم کی خلاف ورزی کی جس پر وہ ایمان لے آیا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا "لا تکتموا الشہادۃ" (بقرہ ۲۸۳) یعنی "اے لوگو! شہادت کو چھپانے کی کوشش مت کرو" اب یہ کسی جرم کی گواہی ہو یا کسی شہید مظلوم وغیرہ کی راہِ حق میں جاں سپاری جہاں تک علم ہو صاف طور پر بیان کرو اور شہادت کو ہرگز نہ چھپاؤ۔

لیکن یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انہی لوگوں نے جو اس کلام وحی نظام پر ایمان لائے تھے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ انہوں نے کتمانِ شہادت کے لئے تاویل و توجیہ سے کام لیا اور معلوم حق کو نامعلوم باطل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس میں سے اکثر نے عمداً و ارادۃً گناہانِ کبیرہ کی پردہ پوشی کی انہوں نے بیگناہ لوگوں کو قتل کیا اور اپنے جرم کے خلاف شہادت کو مختلف حیلوں سے مستور کیا۔ بعد کے مورخین نے بھی قبائلی عصبیت کے سبب نہ صرف ان کے جرائم کی پردہ دری نہیں کی بلکہ انہیں بے گناہ ثابت کرنے اور انکے جرائم پر ضخیم پردہ ڈالنے کے لئے اپنے بہترین دلائل پیش کرنے کی مہارت کا کمال اظہار کیا ہے۔

یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ کسی بھی صورت کا غیر جانبدارانہ کردار تاریخ کا مرتب کرنا ممکن نہیں ہے لیکن کسی موضوع کا اقراراً و اعلاناً حقیقت کو چھپانا اور ناحق کو حق کہا جانا بھی بیشتر تاریخ نویسی کی روش ہے اور ایسی تاریخ پر اعتماد کرنا گویا خود کو کذب و بطالت کی راہ پر لے چلنے کے مترادف ہے۔

اقوامِ عالم کی تاریخ میں کوئی ایسا مرحلہ پیش نہیں آیا جہاں کوئی ایک سیاسی یا مذہبی شخصیت نزاعی کردار کی حامل ہو۔ اگر کبھی ایسی صورت پیش آئی بھی ہے تو ان مورخین، جنہوں نے اسے

نیک یا بدکردار ہونے پر اتفاق رائے کرلیا ہے۔ یہ "فخر" صرف اسلامی تاریخ کو حاصل ہے جہاں بیشمار
سیاسی و مذہبی شخصیات کے کردار کا آج تک تعین نہ ہو سکا کہ وہ تاریخی اعتبار سے نیک کردار تھے یا
بدکردار۔ وہ مذہبی اعتبار سے دیندار تھے یا دنیادار اور اخلاقی اعتبار سے وہ عاقل تھے یا سفاک قاتل؟
ان ہی میں سے ایک اسلامی تاریخ کا مشہور خلیفہ مامون ہے جسے کھلا قاتل ہونے کے
باوجود متعصب مورخ قاتل کہنے سے عمداً گریز کرتے ہیں۔ بعض مورخین نے اسے ایک دیندار ہیرو ثابت
کرنے کی بے جا اور ناکام کوشش کی ہے اور ہم اپنی اس کوشش کو کامیاب کوشش تصور کرتے ہیں
جس میں ہم نے ان ہی مورخوں کے بیانات اور خود مامون کے کردار، اعمال، اقوال و افعال اور اس کے
خو بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ہی حضرت امام علی رضاؑ کا قاتل ہے جس نے زہر سے قتل کرنے
کے بعد آپ کی شہادت کو مستور رکھا اور بعد میں مستقبل کے مورخین نے اس عمل میں اس کی تعصب کے سبب
مدد کی۔

پیش آمدہ تاریخی واقعات کے بعد قتل پر دلائل ملاحظہ کیجئے۔

مصنف

امام ہشتم

حضرت علی الرضاؑ کے حالاتِ زندگی

ہاشم خراسانی کی مستند تاریخ "منتخب التواریخ" کی رو سے آپ کی مبارک ولادت بروز جمعہ ماہِ ذیقعدہ کی گیارہ تاریخ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ پیدائش کا ہجری سن ۱۴۸ ہے جس کی مطابقت ۷۶۵ سن عیسوی کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت آپ کا نام گرامی آپ کے جدِ امجد واعلیٰ کے نام پر "علی" رکھا گیا۔ آپ کا لقب رضا اور کنیت ابوالحسن قرار پائی آپ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی موسیٰؑ الکاظم تھا جو امام جعفر صادق کے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام خیزرانؑ بیان کیا گیا ہے۔ مطالب السئول کے مولف محمد بن طلحہ شافعی کے مطابق "شقراء النوبیۃ" بھی ذکر کیا گیا ہے بعض نے نجمہ لکھا ہے ممکن ہے یہ لقب ہو آپ کی کنیت اُم البنین تھی۔ آپ کی شہادت عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں ۲۳ ذیقعدہ ۲۰۳ھ مطابق ۸۱۸ء طوس (ایران) کے مقام پر زہر خورانی سے واقع ہوئی یوں آپ نے کل پچپن برس کی عمر پائی۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی ولادت کے وقت عباسی عہد کا خلیفہ منصور تھا جسے تاریخِ خلافتِ عباسیہ میں "السفاح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور "سفاح" کے معنی سنگدل، قاتل و خونریز" کے بھی کئے گئے ہیں۔ آپ کی وفات "مامون" کے عہد میں ہوئی اس طرح آپ نے ان دونوں خلفائے عباسی کے علاوہ، ان کے درمیان گذرنے والے مزید تین خلفاء مہدی، ہادی اور ہارون" کا زمانہ بھی پایا تھا۔ آپ کی ولادت منصور کی وفات سے دس سال قبل ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں منصور کی وفات کے وقت آپ کی عمر دس سال تھی۔ منصور کی وفات ۱۵۸ھ میں ہوئی۔ اس کی جگہ "مہدی" عباسی تختِ خلافت پر بیٹھا۔ یہ خلیفہ بھی منصور سفلی کی طرح اہلبیت کا دشمن تھا۔ اس وقت تک حضرت امام علی رضاؑ کے

والد ماجد حضرت امام موسیٰ الکاظم مدینہ منورہ میں تھے اور سیاست سے دور خاموش زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک "مہدی" نے آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے بغداد طلب کر لیا۔ آپ بغداد پہنچے تو قید کا حکم صادر ہوا اور چند روز بعد ایک شخص حمید بن قحطبہ کو مہدی نے حکم دیا کہ وہ آج رات امام موسیٰ کو قید خانہ ہی میں قتل کر دے۔ لیکن اسی رات "مہدی" نے حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا، جو اس سے کہہ رہے تھے کہ "تجھے حکومت اسی لئے دی گئی ہے کہ تو اپنے ہی قرابت داروں کو قتل کرے؟" مہدی کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے حکم کو واپس لے لیا اور آپؑ کو رہائی دے کر مدینہ روانہ کر دیا۔

مہدی کے بعد ہادی نے خلافت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ اور ہادی کی وفات کے بعد ہارون رشید تخت خلافت پر بیٹھا۔ ہارون کے زمانہ تک حضرت امام موسیٰ کاظم زندہ تھے اور مدینہ میں مقیم تھے۔ ہارون کا دل بھی اہلبیت کی طرف سے صاف نہ تھا۔ وہ ایک روز مدینہ کے قریب سے گزرا تو امام موسیٰ کاظمؑ کو اپنے ہمراہ بغداد لے آیا اور پھر انہیں بصرہ کے والی عیسیٰ کے حوالے کر دیا وہ ایک سال بصرہ میں قید رہے۔ اس دوران ہارون نے عیسیٰ کو لکھا کہ وہ امام موسیٰؑ کو قتل کر دے مگر اس نے انکار کیا اور جواباً لکھا کہ جب وہ آپ کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کرتے تو انہیں کس بنیاد پر قتل کیا جائے؟ لیکن ہارون بضد رہا اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ امام موسیٰؑ کو "سندی بن شاہک" کی نگرانی میں دیدے۔ جب والیٔ بصرہ عیسیٰ نے حضرت کو مذکورہ شخص کے حوالہ کر دیا تو ہارون نے اسے حکم لکھا کہ وہ حضرت موسیٰ الکاظمؑ کو جب بھی موقع دیکھے بلا تامل قتل کر دے۔ اس نے آپ کو قتل کر دیا۔ لیکن "تاریخ خمیس" بتاتی ہے کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے امام کو ہارون کے حکم سے تازہ خرمہ میں زہر دیدیا تھا۔ بہرحال حضرت امام نے ۱۸۳ھ میں وفات پائی۔ ایک مستند روایت کے مطابق آپ سات سال ہارون کی قید میں رہے۔ اس طرح اپنے والد کی وفات کے وقت حضرت امام علی الرضاؑ کی عمر پینتیس ۳۵ سال تھی۔ اگر آپ کے والد کی مدتِ قید کے سات سال اس سے نفی کر دیے جائیں تو آپ پورے اٹھائیس ۲۸ سال اپنے والدِ ماجد کی نگرانی میں زیرِ تربیت رہے یوں حضرت امام علی رضاؑ نے تمام دینی علوم کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اور اس تمام عرصہ میں آپ مدینہ ہی میں مقیم رہے۔

جب مہدی نے حضرت موسیٰ کاظم کو مدینہ سے بلا کر قید کیا تھا اور اپنے ارادہ قتل میں بہ سبب خواب کامیاب نہیں ہوا تھا تو آپ کو مدینہ بھجوا دیا تھا۔ اس وقت امام موسیٰ کو یقین ہو گیا تھا کہ کسی وقت بھی دشمن اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے آپؑ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے امام علی رضاؑ کو چند معززین کی موجودگی میں اپنے بعد امام مقرر کر دیا تھا۔ اس مقصد کیلئے آپ نے وصیت نامہ تحریر کیا اور اس پر معزز حاضرین سے بطور گواہ دستخط کرا لئے تھے۔

۱۸۳ھ میں جب آپ کی عمر پینتیس ۳۵ سال تھی آپ نے مسندِ امامت کو زینت بخشی۔ اہلِ مدینہ اور دیگر عقیدتمند دینی مسائل اور دوسری مشکلات میں آپ سے رجوع کرنے لگے۔ تعلیم و تبلیغ اور اشاعت دین میں آپ کے دادا حضرت امام جعفر صادقؑ کے بعد آپ ہی کا نام لیا جاتا ہے پورے بیس سال پوری تندہی سے آپ تبلیغ فرماتے رہے۔ حضرت اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد بیس سال امامت کے فرائض بحسن و خوبی ادا فرماتے رہے۔ اس کل مدت کا نصف عرصہ یعنی دس سال "ہارون الرشید" خلیفہ عباسی کے عہد میں گزرے کیونکہ ہارون کا انتقال بقول "یعقوبی" ۱۹۳ھ میں ہوا۔ باقی دس سال مامون الرشید کے عہد میں گزرے۔

ہارون رشید نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کو قتل کرانے کے بعد یہ عہد کیا تھا کہ "اس کے بعد اگر کوئی شخص (حضرت امام موسیٰ بن جعفر کاظم کے بعد امامت کا دعویٰ کرے گا تو وہ بلا تامل اُسے قتل کرا دے گا"۔ ہارون رشید کے اس عہد کا گواہ عیسیٰ بن جعفر تھا۔ اور یہ وہ شخص ہے جسے ہارون رشید نے پیشگی یہ حکم دے رکھا تھا کہ اس کے بعد جو شخص امامت کا دعویٰ کرے وہ یعنی عیسیٰ بن جعفر اُس کی گردن اڑا دے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم کی شہادت کے بعد ایک بار ہارون "رقہ" کے مقام سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ دورانِ سفر عیسیٰ بن جعفر نے ہارون سے اس "حکم معہود" کا ذکر کیا اور کہا کہ حضرت موسیٰ کا بیٹا "علی" ان کے قتل کے بعد امامت کا دعویٰ کرتا ہے" یہ سُن کر ہارون سوچ میں پڑ گیا اور اُس نے کہا "کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ان سب کو قتل کرا دوں؟" تاریخ یعقوبی سے پتہ چلتا ہے کہ جعفر بن یحییٰ نے جب اس گفتگو کا ذکر کیا تو موسیٰ بن مہران نامی شخص نے یہ

بات سنی اور فوراً امام رضاؑ کی خدمت میں مدینہ پہنچ کر اس منصوبہ کی اطلاع دی۔ آپؑ نے جواباً فرمایا "اے ابن مہران! قسم بخدا وہ میرے خلاف کچھ بھی کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتا" اور ایسا ہی ہُوا۔

تاریخ واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ایران کا "برمکی" خاندان خلفائے بنی عباس کی سیاسی مشکلات حل کرنے میں پیش پیش رہا۔ یہ خاندان ملکی و انتظامی سیاست میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا جبکہ عرب کا عباسی خاندان حکومت و سیاست میں کسی تجربہ سے آشنا تک نہ تھا۔ عباسی خلافت کا استحکام ایران کے اسی برمکی خاندان کے افراد کا مرہونِ منت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ برمکی، جو خلافت عباسیہ میں وزارت کے عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھوں میں رکھی۔ وہ اپنے اقتدار و اختیار میں کسی قسم کی کمی آنے دینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور ہر ایسے شخص کو قتل کرا دیتے تھے جسے وہ خلفاء کے زیادہ قریب دیکھتے تھے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ خلافت بنی عباس نے، علویوں ہی سے، فریب کارانہ غصب کی تھی۔ اس وجہ سے علوی بنی عباس سے ناراض تھے اور وہ حکومت میں خلفائے بنی عباس سے تعاون نہیں کرتے تھے۔ اور مسلسل حقِ خلافت کے دعویدار تھے۔ ایک طرف بنی عباس علویوں کی جانب سے مخالفت، عدمِ تعاون اور پے بہ پے خروج و بغاوت کے اندیشہ میں مبتلا تھے۔ دوسری طرف برامکہ ان دونوں میں صلح و صفائی اور ان کے درمیان مشارکت و مقاربت سے خوفزدہ تھے۔ لہٰذا برمکی بھی اہلبیتِ رسول کے خاندانی افراد سے عداوت رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اہلبیتِ رسالت کا کوئی فرد دربار میں رسائی اور خلیفہ کی قربت حاصل نہ کرنے پائے۔ اسلئے یہ لوگ بھی ان افراد کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کرنے کی جستجو میں مصروف اور خلیفۂ وقت کو عوام کے دل میں ان افراد کی عزت و احترام سے خوفزدہ کرنے میں منہمک رہتے تھے۔

"تاریخِ یعقوبی" میں لکھا ہے کہ انہی دنوں جب حضرت امام علی رضاؑ اپنے والد کی شہادت کے بعد ان کی جگہ مسندِ امامت پر رونق افروز تھے یحییٰ بن خالد برمکی نے ہارون کی توجہ امام رضاؑ سے نجات حاصل کرنے کی طرف دلائی تھی اور کہا تھا کہ میرا خیال ہے ان سے بھی نجات حاصل کر لینی چاہیئے۔ مگر ہارون نے اس کے جواب میں یہ کہا تھا کہ "کیا جالے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے

جو ہم ان کے والد موسیٰ بن جعفر کے ساتھ کر چکے ہیں ؟ اور ہارون نے یحییٰ کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی ۔ اسے اپنی غلطی اور زیادتی کا گویا احساس تھا لیکن اس کے باوجود وہ عوام کے دلوں میں قائم اس احترام و عقیدت کو ہرگز گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو امام کی روحانیت اور علم و معرفت کے اظہار سے ان کے دلوں میں استحکام حاصل کر چکی تھی ۔ لوگ اپنا روحانی پیشوا امام وقت ہی کو تسلیم کرتے تھے اور دینی و روحانی امور میں انہی سے رجوع کرتے تھے ۔ اور یہ صورت حال اسے پسند نہ تھی ۔ چنانچہ اسی دوران ایسا وقت بھی آیا جب ہارون نے حضرت علی رضاؑ کو بھی قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ۔

ائمہ اثنا عشری کی سیرت سے متعلق روایات میں ایک راوی " ابی الصلت ہروی " کی روایت ملتی ہے وہ کہتا ہے کہ " ایک مرتبہ امام علی رضا علیہ السلام اپنے گھر بغداد میں موجود تھے کہ ہارون رشید کا قاصد آپ کے مکان پر پہنچا اور خلیفہ کا یہ حکم سنایا کہ امیر المومنین اسی وقت آپ کو یاد فرما رہے ہیں ۔ آپ یہ سن کر قاصد کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے اور کچھ سوچتے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے " ہارون نے مجھے اس وقت بلوایا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یقیناً مجھے کوئی گزند پہنچانا چاہتا ہے ۔ لیکن واللہ وہ میرے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ ان الفاظ کو جھٹلانے کی ہمت رکھتا ہے جو میرے جد اعلیٰ رسول اکرمؐ نے میرے حق میں فرمائے ہیں ۔ پھر آپؑ ہارون کے محل کی طرف روانہ ہو گئے میں بھی آپؑ کے ساتھ تھا ۔ جب آپ اس کے محل میں داخل ہوئے اور ہارون سامنے آیا تو آپؑ نے وہی کلمات ادا کئے جو آپؑ کے بارے میں آپؑ کے جد اعلیٰ رسول اللہؐ نے فرمائے تھے ۔ ہارون کی حالت میں ایکدم تغیر رونما ہوا اور اس نے آپ کو دیکھتے ہی کہا یا ابوالحسنؑ ! آپؑ ہمیں اپنے خانوادے کی ضروریات سے آگاہ کریں تاکہ ہم انہیں پورا کرنے کا حکم دیں ، اور ہم نے فی الحال آپ کی ضروریات کے لئے دو ہزار درہم کا حکم دیا ہے ۔ کچھ دیر بعد جب آپؑ اپنے گھر واپس تشریف لے جانے کیلئے کھڑے ہوئے تو ہارون الرشید نے کہا " میں نے ایک ارادہ کیا تھا مگر اللہ کا ارادہ اس کے خلاف تھا اور اللہ ہی کا ارادہ بہتر تھا "

ان حالات و واقعات کو پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا تھا ایسی خبریں عامتہ الناس

تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اہلبیتؑ اظہار سے عداوت کا جو سلسلہ اور طریقہ معاویہ بن ابوسفیان سے چلا آرہا تھا لوگ اس سے بخوبی واقف تھے۔ دورِ بنوعباس میں خلفاء و وزراء کے عناد اور اہلبیتؑ کے خلاف ان کے طور طریقوں سے بھی اچھی طرح باخبر تھے۔ حضرت علیؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا رہا۔ حضرت حسنؑ کو ان کے حق سے کیونکر محروم کیا گیا۔ امام حسینؑ کو کس طرح کربلا میں شہید کیا گیا امام زین العابدینؑ نے کس، کس مپرسی میں زندگی گزاری، حضرت امام باقرؑ نے کیسی کیسی پابندیوں اور نظربندیوں میں عمر بسر کی، امام جعفر صادقؑ نے خلیفۂ وقت کی کیسی قدغنوں کو برداشت کیا اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے جن قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے شہادت پائی اس سے کون واقف نہ تھا؟ اور ان تمام ائمہ کو یکے بعد دیگرے کس طرح زہر کے خفیہ حربے سے شہادت تک پہنچایا گیا اس زمانے کا کون سا ایسا فرد تھا جو اس سے واقفیت نہ رکھتا ہو ولید بن عبدالملک نے امام زین العابدینؑ کو زہر سے شہید کیا ہشام بن عبدالملک نے امام محمد باقرؑ کو زہر دلوایا۔ منصور دوانقی نے امام جعفر صادقؑ کو زہر سے شہید کرایا۔ ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظمؑ کو قید خانہ میں زہر دلا کر شہید کیا یہی سبب تھا، جب امام رضاؑ نے منصبِ امامت سنبھالا اور علی الاعلان دینِ حق کی اشاعت، علوم اہلبیتؑ کی بلاغت اور تقاضائے وقت کے امور شناعت کے اظہار کا آغاز کیا تو آپ کے عقیدت مند گھبرائے انہیں خوف تھا کہ کہیں آپ کے ساتھ بھی یہی سلوک نہ کیا جائے۔ اس لئے یہ مخلص حضرات حسبِ موقع دبے الفاظ میں آپ سے اس خدشہ کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اور آپ ان کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتے تھے کہ "تم اس کی ہرگز فکر نہ کرو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہارون خواہ کتنی ہی کوشش کر لے وہ فی الحال مجھے گزند پہنچانے کی جرات کسی طور نہیں کر سکتا۔

ایک معتبر راوی، محمد ابن سنان کی ایک روایت، روضۃ الکافی میں ملتی ہے۔ جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جہاں امام علی رضاؑ کے حالات درج ہیں ان میں یہ روایت درج ہے کہ "محمد بن سنان نے بیان کیا کہ ہارون رشید کے زمانہ میں جب امام ابوالحسن علی الرضاؑ با شہرت ہوا تو میں نے امامؑ سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی امامت کو لوگوں پر افشاں کر دیا ہے۔ اور ہارون کی تو ابھی تک تلوار ابھی میان سے باہر ہے۔" کے جواب میں بھی آپؑ نے ان ہی الفاظ

میں محمد بن سنان کو اشتیاق دلایا تھا۔

اسی طرح "رجال الکشی" اور "کافی" میں محمد بن یعقوب اور صفوان بن یحییٰ کی روایتیں ملتی ہیں۔ ان دونوں نے بیان کیا کہ جب امام موسیٰ کاظم کو شہید کر دیا گیا اور ان کے فرزند امام ابوالحسن علی رضا نے فرائض امامت کی ادائیگی کا علی الاعلان آغاز کر دیا تو ہم سب لوگوں کو خلیفہ کی جانب سے آپ کی زندگی کے لئے خطرہ کا احساس ہوا۔ اور ایک روز موقع دیکھ کر ہم سب نے آپ سے عرض کیا کہ ہم آپ کے بارے میں فکر مند ہیں اور ہمیں ڈر ہے کہ خلیفہ کے کارندے آپ کو کوئی زک نہ پہنچائیں" اس کے جواب میں آپ نے یہی فرمایا کہ "وہ فی الحال مجھے کسی قسم کا گزند پہنچانے کی جرأت نہیں رکھتا" بعد کے حالات نے اس بات کی پوری تصدیق کر دی کہ امام کا خیال اور اس پر یقین قطعی درست تھا۔ اس لئے کہ گرچہ ہارون نے ابتداء میں آپ کو تباہ و ذلیل کرنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ ایک بار بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد وہ خود خانگی سیاست میں اس طرح الجھا کہ اسے خود اپنی ذات کا بھی ہوش نہ رہا۔ ولایت ولی عہدی کے مسئلہ نے ہارون کے ہوش و حواس برانگیختہ کر ڈالے تھے اور اس کی زندگی ہی میں "امین" اور "مامون" کی رقابت اپنا رنگ لانے اور دکھلانے لگی تھی۔

ہارون نے ابتدائی دور میں حضرت امام علی رضا کو قتل اور ذلیل کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے ہم ایک کا ذکر یعنی ابی الصلت ہروی کی روایت بیان کر چکے ہیں۔ عقیدتمندوں اور مخلص تذکارون کی نظروں میں آپ کو ذلیل و خوار کرنے کا ایک مسلسل اور مستند واقعہ بیان کئے دیتے ہیں۔ اس سے ہارون کا آپ سے بغض اور آپ کے بارے میں اس کے ارادے کا اظہار بخوبی ہو جائے گا۔

ہارون رشید کے خلیفہ بننے کے چند سال بعد جعفر بن محمد نے خروج کا اعلان کیا۔ ہارون کو خبر پہنچی تو وہ بدحواس باختہ ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے بھی خروج ہوتے رہے تھے، علم بغاوت بلند کیا جاتا رہا تھا۔ علویوں کے حق خلافت کا دعویٰ بدستور موجود تھا۔ ہارون جب سے خلیفہ ہوا یہ خطرہ و خوف برابر اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی اس نے اپنے ایک انتہائی قابل اعتماد اور بھروسہ کے آدمی "جلودی" نامی کو ایک بڑا لشکر دے کر اس بغاوت کو پوری طرح کچلنے، اہل مدینہ کو تباہ و برباد کرنے اور آل ابی طالب کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس نے روانہ ہوتے وقت "جلودی" کو واضح الفاظ میں بالکل ویسا ہی حکم دیا جیسا یزید بن معاویہ نے اہل مدینہ کی بغاوت کو

کچلنے کے لئے۔ لشکر کی روانگی کے وقت مسلم بن عقبہ کو دیا تھا۔ یزید نے سپہ سالار لشکر مسلم بن عقبہ سے کہا تھا کہ "جب تم اہل مدینہ پر قابو پالو تو تمام لشکر کو تین روز تک عام اجازت ہے کہ وہ اہل مدینہ اور ان کی عورتوں کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں"۔ چنانچہ تین روز تک لشکر کا ہر فرد مدینہ کے گھروں کو لوٹتا رہا اور عورتوں کے ساتھ نازیبا اور شرمناک سلوک کرتا رہا۔ تاریخ اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے ایسے ناجائز حمل کی تعداد بھی بتاتی ہے جو اس دوران ہو گئے تھے۔ اس ظلم و تعدی کا نشانہ اصحابؓ رسولؐ اور ان کے گھرانے بھی بنائے گئے تھے۔ اسلام کی تاریخ میں اس شرمناک واقعہ کو "واقعہ حرہ" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ جنگ مدینہ کے قریب حرہ کے مقام پر ہوئی تھی۔ اس فتح کی خبر سن کر یزید نے بیساختہ یہ کہا تھا کہ "آج میں نے بدر کا بدلہ لے لیا ہے"۔ یہ الفاظ واقعہ حرہ کی تاریخ میں موجود دیکھے جا سکتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی حکم ہارون رشید نے لشکر کی روانگی کے وقت "جلودی" کو دیا تھا اس نے کہا تھا "جب تم جعفر بن محمد پر قابو حاصل کر لو تو اسی فتح پر خاموشی اختیار نہ کر لینا بلکہ فوراً آل ابی طالب کے گھروں پر حملہ آور ہو جانا انہیں اس طرح لوٹنا کہ کسی عورت کے جسم پر زیور ہی نہیں لباس کا ایک تار تک باقی نہ رہے جس سے وہ اپنی ستر پوشی میں مدد لے۔

جس طرح حرہ کا تاریخی واقعہ، اہل بدر اور اہلبیت سے یزید کی شدت عداوت کو ظاہر کرتا ہے بالکل اسی طرح ہارون رشید کا یہ تاریخی حکم آل ابی طالب سے اس کی قلبی عداوت کا اظہار کرتا ہے یزید نے تو "بدر" کا انتقام لیا تھا جو میں اس کے عم زاد اسلامی لشکریوں کے ہاتھوں قتل و قید ہوئے تھے۔ مگر ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ ہارون یا ہارون سے پہلے کے خلیفہ عباسی آل ابی طالب سے کس چیز کا بدلہ لے رہے تھے؟

جس طرح مدینے کے نہتے لوگ یزید کی مسلح اور آزمودہ کار فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اسی طرح جعفر بن محمد کے ناآزمودہ چند ساتھی ہارون کی کثیر مسلح فوج کا کیونکر مقابلہ کرتے۔ جب "جلودی" ان لوگوں پر فتح حاصل کر چکا اور گرفتار شدگان میں سے بعض کو قتل کی سزا دے چکا تو اس نے سپاہیوں کو آل ابی طالب اور اہلبیت کے گھروں کو لوٹنے کا حکم دیا۔ لشکری گھروں میں گھس گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ عورتوں کو بے عزت کیا اور ان کے جسم پر ایک معمولی چیز تک نہ رہنے دی۔ جلودی جب چند سپاہی اپنے ہمراہ لیکر امام علی رضاؑ کے گھر پہنچا تو حضرت

حضرت امام عالی مقام ننگی تلوار لئے اپنے دروازہ اور "جلودی" کے درمیان حائل ہو گئے۔ جلودی نے آپ کے تیور دیکھے تو نرم پڑا اور گزارش کی کہ خلیفہ نے مجھے یہ حکم دیا ہے اور ساتھ تاکید بھی کی ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس حکم کی تعمیل کروں۔ ساتھ ہی ہارون کے الفاظ میں وہ حکم بھی بیان کر دیا۔

امام علی رضاؑ نے جواباً فرمایا۔ "اگر صرف اس قدر بات ہے تو میں اس حکم کی تعمیل میں تمہاری اعانت کر سکتا ہوں لیکن اگر کوئی اور ارادہ ہے تو تلوار میرے تمہارے درمیان حائل رہے گی۔ میں عورتوں کے جسم پر موجود تمام چیزیں اتار کر تمہیں دیدوں گا کہ خلیفہ کے حق میں تمہاری اطاعت برقرار رہے اور قسم بخدا کسی عورت کے جسم پر کوئی چیز باقی نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر آپ اندر گئے۔ جلودی اپنے سپاہیوں کے ہمراہ دروازہ پر منتظر رہا۔ آپ نے حسب وعدہ ایک ایک چیز خواہ وہ معمولی تھی یا غیر معمولی اس کے سپرد کر دی۔ اس واقعہ کو نہ صرف مورخ "ابن اثیر" نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے بلکہ علامہ ابن کثیر دمشقی نے بھی "البدایہ والنہایہ" میں ذکر کیا ہے

اس کے بعد ہارون کو امام کی ذات کی طرف توجہ دینے کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنی خانگی سیاست اور اپنے بیٹوں خاص طور پر امین و مامون کی ولی عہدی کے مسئلہ میں ایسا الجھا کہ اسی فکر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

علامہ شبلی نعمانی نے ہارون رشید کے بارہ بیٹے بتلائے ہیں۔ ان میں سے صرف چار اس لائق تھے جنہیں ولی عہد منتخب کیا جا سکتا تھا۔ یہ امین، مامون، موتمن اور معتصم تھے۔ معتصم اگرچہ بہادر تھا لیکن جاہل تھا۔ اس لئے ہارون نے اپنے بعد خلیفہ ہونے کے لئے امین کے حق میں بیعت لی۔ امین کے بعد مامون اور پھر موتمن کیلئے بیعت لی گئی۔ وہ تینوں میں سلطنت کے مختلف علاقے تو تقسیم کر دیئے بالکل اسی طرح جس طرح شاہجہان بادشاہ ہند نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کو علاقے تقسیم کر دیئے تھے اس خیال سے کہ ان میں سلطنت کیلئے جنگ نہ ہو۔ دارا شکوہ کو ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔ لیکن ان میں جنگ ہوئی اسی طرح ہارون کے بیٹوں کے درمیان بھی جنگ ہوئی حتی کہ ہارون کی زندگی ہی میں اس کے دو بیٹوں امین اور مامون میں اختلافات رونما ہو چکے تھے ہارون مامون کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر اسے بعد اسے خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ مامون کی ماں ایرانی النسل تھی جبکہ امین کی ماں زبیدہ عرب تھی۔ اسکا ماموں عیسیٰ بن جعفر

دربار کی اہم شخصیت تھا دوسری طرف اکثر دربار کے ارکین اور فوج کے افسر بنی ہاشم و بنی عباس سے تھے اس لئے وہ بھی امین کے حق میں تھے۔ یہ وہ دباؤ تھا جس کی وجہ سے ہارون نے "امین کو اپنے بعد خلیفہ قرار دیا لیکن احتیاطاً امین کے بعد مامون کے خلیفہ ہونے کی بیعت بھی درباریوں سے لی تھی اور اسے کچھ مراعات بھی دے رکھی تھیں۔ مامون کے حصے میں سرسبز و شاداب علاقے تھے۔ ان وجوہات سے امین کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور وہ محسوس کرنے لگا جیسے مامون ہی ولی عہد اول ہے۔

ہارون رشید نے ۱۹۳ھ میں وفات پائی امین اس کی جگہ خلیفہ ہوا۔ امین و مامون کے درمیان اختلاف اور شبہات تو پہلے ہی تھے۔ امین کے خلیفہ ہونے کے بعد "فضل بن ربیع" نے امین کو مامون کے خلاف بھڑکایا۔ امین نے مامون کو ولی عہدی سے معزول کر دیا اور حکم جاری کیا کہ اس کے بعد مامون کی جگہ اس کے بیٹے موسیٰ کا نام ممبروں سے پکارا جائے۔ اس حکم کا جاری ہونا تھا کہ دونوں طرف کی فوجیں میدان میں اتر گئیں۔ مامون کے سپہ سالار طاہر نے امین کی فوجوں کو بغداد میں شکست فاش دی اور امین کا سر قلم کر کے مامون کے پاس روانہ کر دیا۔ امین و مامون تقریباً چار سال باہم برسر پیکار رہے۔

مامون تخت خلافت پر متمکن ہوا تو فضا بدستور مکدر تھی۔ امین کے قتل سے خاندان کے بزرگ خوش نہ تھے۔ علوی پہلے ہی ناراض تھے اسے ہر طرف سے بغاوتوں کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اس کا ذہن ایک نئے نہج سے سوچنے پر مجبور تھا۔ کچھ ہی مدت گزری تھی کہ پہلی بغاوت نے کوفہ سے سر اٹھایا۔ مامون الرشید کے متعلق عہد ۱۹۹ھ میں ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی بن ابی طالب نے کوفہ سے خروج کیا۔ انہوں نے کوفہ پر قبضہ کر لیا اور سکہ بھی اپنے نام کا ڈھلوایا۔ لوگوں کو علوم آل محمد اور کتاب و سنت کی دعوت دینے لگا۔ اس نے مسلح فوج بھی ترتیب دے لی۔ زہیر بارہ ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کیلئے کوفہ کی جانب روانہ ہوا۔ ابو عبداللہ نے جو ابن طباطبا کے نام سے مشہور تھا زہیر کو شکست دی اور تمام مال لوٹ لیا لیکن اس کے فوراً بعد ابن طباطبا کا اچانک انتقال ہو گیا۔

اسی سن میں حضرت امام علی الرضاؑ کے بھائی ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر نے مامون کے خلاف مکہ سے خروج کیا لیکن جب پہنچیں کوفہ میں ابن طباطبا کا حال معلوم ہوا تو وہ مکہ سے یمن کی طرف کوچ کر گئے یمن میں مامون کی طرف سے بنی عباس کا ایک فرد اسحاق بن موسیٰ عامل تھا۔ آپ فوراً صنعا کی طرف گئے اور بہ مدد دوستوں نے یہاں فوج ترتیب دے کر آپ نے یمن پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔

اسی سال مکہ میں لوگوں نے محمد بن جعفر بن علی بن الحسینؑ کی خلافت کیلئے بیعت کرلی اور ان کو امیر المومنین کا خطاب دیا، وہ کئی ماہ مکہ پر حکمران رہے۔ اسی طرح حضرت امام علی الرضا کے ایک اور بھائی زید بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی علیہ السلام نے بھی بصرہ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اسماعیل بن جعفر صادق کے پیروکار بھی مامون کے خلاف صف بستہ اور متحد تھے۔

یہی حالات مامون کیلئے فکر و پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے مامون سیاسی معاملات کو ایک نئے رُخ سے سوچنے پر مجبور ہوا۔ وہ یقین کر چکا تھا کہ علوی اور بنی فاطمہ پورے طور پر اس کے مخالف اور متحد ہیں اور ان پر ہمیشہ کے لئے قابو پانا دائرۂ امکان سے باہر ہے۔ وہ امام وقت حضرت علی رضاؑ کے لوگوں پر روحانی اثر کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اہلِ مدینہ پر ائمہ اطہار کا کس قدر اثر و رسوخ ہے۔ وہ اس سے بھی باخبر تھا کہ خراسان کا تمام علاقہ امام عالی مقام کا معتقد اور ایک اشارۂ ابرو پر جان و تن کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اور اگر حالات زیادہ خراب ہوئے یا اسی طرح خروج کا سلسلہ جاری رہا اور خود امام علیہ السلام تلوار بکف میدان میں آگئے تو کسی طاقت سے انہیں دبانا ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے اس نے ایک نئی سیاسی راہ نکالی اور عوام کے سامنے اسے مذہب کے رنگ میں پیش کیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اسے اس قسم کا مشورہ حسن بن سہل نے دیا تھا۔ کچھ بھی ہو مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مامون نے گزشتہ خلفائے عباسیہ کے مقابلہ میں فریب کارانہ محبت و اخوت اور ظاہری عقیدت کے حربے سے کام لیا اور عوام میں اس خیال کو شہرت دی کہ مامون اہلبیت کا خیرخواہ ہے اور ان کے حقِ امامت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نے عوام الناس میں اس خیال کی بھی تشہیر کی کہ وہ خلوصِ دل سے چاہتا ہے کہ خلافت کا حق بھی اس کے صحیح حقدار تک پہنچ جائے۔ اس نے سب سے پہلے ایک فرضی "منت" کی حکایت کو مشتہر کیا کہ جب میری افواج امین سے برسرِ پیکار تھیں تو میں نے شدت سے یہ منت مانی تھی کہ اگر میں اس بے سروسامانی میں امین پر فتح و کامرانی حاصل کر سکا تو بنی فاطمہ میں جو شخص اہل ہوگا خلافت اس کے سپرد کر دوں گا۔ سو مجھے کامیابی نصیب ہوئی اب میں چاہتا ہوں کہ امامِ وقت، حضرت امام علی رضاؑ کو ان کا غصب شدہ حق یعنی خلافت سپرد کردوں

اس کے ساتھ ساتھ مامون نے کچھ ایسے الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے اور چند ایسے امور انجام دیئے جس سے اس کا محب اہلبیت ہونا ظاہر ہونے لگا۔ حتی کہ بعد میں بعض علماء نے اس کے متعلق یقین کے ساتھ لکھا کہ مامون شیعہ ہو گیا تھا۔ لیکن شیعہ علماء اس خیال کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ مامون کا دکھاوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے پہلے خلیفوں نے جس سے خطرہ محسوس کیا اسے قتل کروا دیا۔ لیکن یہ طریقہ مستقل حل ثابت نہ ہو سکا سوائے اس کے کہ وہ بدنام ہوئے۔ ظالم اور جابر اور دشمن اہلبیت کہلائے، ان کے خلاف عوام میں نفرت پھیلتی چلی گئی اسلئے مامون نے اس راہ کو اختیار کیا تھا۔ وہ یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ اگر مامون اہلبیت سے واقعی محبت رکھتا تھا تو اس نے امام علی رضاؑ کے قاتل کو تلاش کر کے سزا کیوں نہیں دی؟ اگر ایسا نہ کر سکا تو پھر اس کے بعد اس نے اہلبیت کی حفاظت کا کیا انتظام کیا؟ اور آپ کی وفات کے بعد سبز لباس کیوں ترک کر دیا؟ اور آپ کی شہادت کی خبر کو بنی عباس کے لئے خوشخبری کیوں قرار دیا؟ شیعہ علماء نے تو مامون ہی کو امام رضاؑ کا قاتل قرار دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون نے ایک بار حضرت علی علیہ السلام کی تمام صحابہ پر فضیلت کے اظہار پر مناظرہ کیا تھا۔ وہ اپنے تشیع کا اظہار برملا کرتا تھا اس نے متعہ کو حلال قرار دیا تھا۔ اس نے خلق قرآن کا بھی اقرار کیا تھا اور اس نظریہ کی تشہیر بھی کی تھی۔ مامون نے آفاق کو یہ بھی لکھا تھا کہ علی ابن طالب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام مخلوقات پر افضل ہیں۔ اسکے ساتھ ہی اس نے یہ بھی حکم لکھا تھا کہ معاویہ کا ذکر اچھائی سے نہ کیا جائے۔ جو کوئی معاویہ کا ذکر اچھائی کے ساتھ کرے گا اس کا مال اور اس کا خون تم پر مباح ہو جائے گا۔ یہ بھی درست ہے کہ مامون نے حضرت امام رضاؑ کو اپنا ولی عہد بنایا اور اپنی ایک بیٹی کی شادی آپ سے کر دی اور دوسری بیٹی کی شادی آپ کے صاحبزادے حضرت امام محمد تقی سے کی۔ اور وہ علویوں پر احسانات بھی کرتا رہا لیکن یہ تمام باتیں ایک تو اس لئے تھیں کہ وہ ان حقائق سے واقف تھا دوسرے اس لئے کہ وہ پُر امن طریقہ پر اپنا مقصد حاصل کر سکے اور اگر کسی کو قتل کرائے تو لوگ اس پر شبہ نہ کریں۔

تیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے حامیوں، پیروکاروں، اور آپ کے بھائیوں نے مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ اور یمن وغیرہ میں خروج اور بغاوتوں کا سلسلہ

جاری کر رکھا تھا۔ ایک سال گزرنے پر بھی مامون ان پر خاطر خواہ قابو حاصل نہ کر سکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ حالات پر قابو جلد حاصل کر لیا جائے مگر وہ حضرت امامؑ کی عوام میں مقبولیت سے خوفزدہ تھا اسلئے راست اقدام سے گریز کر رہا تھا۔

آخر مامون نے ۲۰۰ھ میں ایک بے ضرر منصوبہ بنایا اور "رجا بن ضحاک" کو مدینہ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ حضرت امام علی الرضا کو "مرو" آنے پر آمادہ کرے اور انتہائی عزت و احترام سے میرے پاس لے آئے۔" مامون نے یہ بھی کہا تھا کہ ساتھ ہی ساتھ بنی عباس کے تمام افراد کو خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے "مرو" میں جمع کر دے۔ رجا بن ابی ضحاک "مدینہ پہنچا اور حضرت امام علی رضا کو "مرو" لے آیا جہاں مامون مقیم تھا۔ اس نے بنی عباس کے افراد کو بھی "مرو" میں جمع کیا اس وقت جو بنی عباس وہاں موجود تھے انکی تعداد "تینتیس" ہزار بتائی جاتی ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کو اس راستے سے "مرو" لایا گیا جس راستے کا تعین پہلے سے مامون نے کر دیا تھا اور یہ راستہ بصرہ، اہواز اور فارس کی راہ سے تھا۔ براہ "قم" "مرو" آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ "قم" کی راہ میں شیعان علیؑ بکثرت آباد تھے اور مامون کو ان کی جانب سے یلغار کا خدشہ تھا۔

جب آپ مدینہ سے رخصت ہونے لگے تو آپ اپنے جد جناب رسول خدا احمد مجتبیٰ کے روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اور آپ نے اپنے جد سے اسی طرح جدائی اختیار کی جس طرح ایک سو چالیس سال قبل آپ کے جد امجد حضرت امام حسین علیہ السلام نے قبر اطہر سے لپٹ کر بار بار زار و قطار روتے ہوئے رخصت حاصل کی تھی کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ دوبارہ روضہ اقدس کی زیارت نصیب نہ ہوگی۔ حضرت امام رضاؑ بھی جانتے تھے کہ دوبارہ مدینہ آنا اور روضہ اطہر پر حاضری دینا نصیب نہ ہوگا۔ چنانچہ آپؑ بار بار قبر اطہر سے لپٹتے اور روتے تھے۔ راوی بیان کرتا ہے حضرت فرماتے تھے کہ "میں اپنے جد کے شہر سے بے یار و مددگار دیار غیر میں جا رہا ہوں۔ وہاں میں غریب الوطنی کی حالت میں اس عالم سے کوچ کروں گا۔ ہارون کی قبر کے ساتھ مجھے دفن کیا جائیگا۔ جب آپ مدینہ سے کوچ کرنے لگے تو آپ نے تمام اعزا اور احباب کو جمع کیا اور ان سے فرمایا جس قدر ہو سکے نوحہ خوانی کرو میرے بعد میں مدینۃ الرسول میں واپس ہرگز نہ آ سکوں گا۔ اس سفر میں آپ "نہا تھے۔ [illegible]

قریب ترین سے کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ اہل و عیال بھی مدینہ میں رہ گئے تھے۔ اسوقت آپ نے صاجزادے اور مستقبل کے امام حضرت محمد تقی الجوادؑ کی عمر صرف پانچ سال بیان کی جاتی ہے۔ آپ نے اپنے خاندان کے افراد اور دیگر حاضرین سے فرمایا یہ "فرزند میرے بعد میرا قائمقام اور جانشین ہوگا اور تم سب اس کی اطاعت کروگے"۔ روانگی کے وقت آپ نے ایک روایت کے مطابق گھر کے اخراجات کیلئے بارہ ہزار دینار چھوڑے تھے۔

سفر منزل بہ منزل

جب آپ "مرو" کیلئے روانہ ہوئے تو آپکی پہلی منزل "قادسیہ" تھی۔ یہاں آپنے قیام کیا "ابن نطی" نامی ایک شخص کی روایت "اخبار و آثار امام رضا" میں درج ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ پر قربان جاؤں ایک روز میں نے اسی مقام (قادسیہ) پر آپ کے والد سے پوچھا تھا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ تو آپ نے مجھے ہونے والے امام کا نام بتایا تھا اور اب میں آپ سے یہی سوال کرتا ہوں کہ آپکے بعد آپکا جانشین کون ہوگا؟ امام عالی مقام نے اپنے بیٹے حضرت محمد تقی الجوادؑ کی طرف اشارہ فرمایا۔

آپ قادسیہ سے روانہ ہو کر ایک چھوٹی بستی "نباج" نامی میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں سے بصرہ دس منزل پر واقع ہے۔ "نباج" کا ایک باشندہ ابو حبیب نامی روایت کرتا ہے کہ میں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے یہ اطلاع دی کہ ابوالحسن علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ "نباج" تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسجد میں مقیم ہیں۔ میں یہ سن کر مسجد میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک طبق آپ کے روبرو رکھا ہے اور اس میں کھجوریں ہیں۔ آپ نے اس میں سے ایک مٹھی کھجوریں مجھے عنایت فرمائیں میں نے گنا تو وہ اٹھارہ کھجوریں تھیں۔ مجھے فوراً اپنا ایک خواب یاد آیا"۔ میں نے پوچھا مولا آپ نے مجھے اس سے زیادہ کھجوریں کیوں نہ دیں۔ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ "اگر میرے جد تمہیں زیادہ دیتے تو میں بھی اسی قدر دیتا"۔ میں نے ایک عرصہ پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ "حضرت رسولِ خدا اور ان کی آل "نباج" آئی ہے۔ اور آپؐ جناح کی جوالی مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا آپؐ کے سامنے ایک کھجوروں سے بھرا طبق رکھا ہے۔ نبی صلعم نے ایک مٹھی بھر کر مجھے کھجوریں دیں تو اس وقت میں نے وہ کھجوریں گنی تھیں اور وہ پوری اٹھارہ ہی تھیں۔

اس کے بعد بصرہ تشریف لائے وہاں قیام کیا اور پھر "اہواز" کی طرف کوچ فرمایا۔ یہ خوزستان کا معروف ترین شہر ہے۔ "اخبار و آثار امام رضاؑ" میں ایک شخص "ابوہاشم جعفری" کی ایک ایسی روایت ملتی ہے جس سے علم طب میں آپ کی واقفیت اور اس پر عبور کا پتہ چلتا ہے۔
وہ کہتا ہے جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ اہواز آئے ہوئے ہیں تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گرم ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس وقت آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ آپ نے مجھے حکم فرمایا کہ کسی طبیب کو تلاش کرو۔ میں ایک طبیب اپنے ساتھ لے آیا۔ طبیب جو دوا آپ کے لئے تجویز کرنا چاہتا تھا آپ نے اسی بوٹی کا نام طبیب کو بتایا اور اس کی خاصیتیں بتا کر دوا تیار کرنے کو کہا۔ طبیب یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؑ علم طب سے واقف اور اس پر عبور رکھتے تھے چنانچہ ایک کتاب "طب الرضاؑ" کے نام سے مشہور پائی جاتی ہے۔ اور ایسا کیوں نہیں ہوتا اس لئے کہ آپ کے دادا حضرت امام جعفر صادقؑ علم طب اور جڑی بوٹیوں کے خواص کے علم میں مہارت رکھتے تھے ابن حیان جو اسلامی طب میں تاریخی شہرت رکھتا تھا آپ ہی کا شاگرد تھا۔ اس طرح طبی صلاحیت آپؑ کو ورثہ میں پہنچی تھی۔

حضرت امامؑ نے "اہواز" سے کوچ کیا اور راستے میں "اَربَق" نامی ایک گاؤں کے پل کے قریب قیام کیا۔ دوران قیام ایک شخص "جعفر بن محمد نوفلی" آپ سے ملا اور دریافت کیا کہ آقا! کیا یہ درست ہے جو ایک گروہ بیان کرتا ہے کہ آپ کے والد محترم فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ و سلامت ہیں؟ آپؑ نے فرمایا وہ لوگ یعنی "گروہ واقفہ" جھوٹ کہتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں پر لعنت کرتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کی میراث کیوں تقسیم ہوتی؟ قسم بخدا میرے والد اسی طرح شہید کئے جا چکے ہیں جس طرح میرے جد علیؑ ابن ابی طالب کو شہید کیا گیا تھا۔

اربق کے پل سے آپ روانہ ہوئے تو نیشاپور کا رُخ کیا۔ راستہ میں ایک بے آب و گیاہ صحراسے گزرنا پڑا۔ حضرت علیؑ کے غلام خاص قنبر کی اولاد سے ایک قنبری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام علی رضاؑ خراسان کی طرف تشریف لے جا رہے تھے میں بھی ہمرکاب تھا جب درمیان سفر بے آب و گیاہ مقام سے گزرے تو پیاس نے شدت اختیار کی پانی موجود نہ تھا۔ قریب تھا کچھ لوگ پیاس سے مر جائیں آپؑ نے فرمایا کہ پانی کی تلاش میں جاؤ اور پھر پانی کے موجود ہونے

خوشخبری کے ساتھ اس کی نشاندہی بھی کی۔ ہم اس جگہ گئے تو پانی موجود پایا۔
صحرا عبور کر کے آپ نیشاپور پہنچے اور وہاں قیام فرمایا۔ عیون اخبار الرضاؑ میں درج ہے کہ
آپؑ نے نیشاپور کے ایک باشندے "ابو جامع محمدؒ کی دادی "خدیجہ بنت حمدانؒ" کے یہاں محلہ "بلاشاباذ"
میں قیام فرمایا تھا۔ اور بعد میں یہ مقام امامؑ کے پسند کرنے کے سبب "پسندیدہ" کہلانے لگا تھا۔
"تاریخ نیشاپور" میں آنجناب کے ورود و قیام کی پوری تفصیل ملتی ہے جو ایک جگہ حیرت انگیز
بھی ہے اور عقیدت اندوز بھی۔ علم و حکمت کا خزینہ ایران کا شہر نیشاپور جو اس وقت اپنا ثانی نہ رکھتا
تھا۔ جہاں مستند علماء کا اجتماع اور معلمین و متعلمین کی کثرت تھی۔ جب شہر میں یہ خبر پھیلی کہ حضرت امام
وقت جناب علی الرضاؑ نیشاپور میں ورود مسعود فرمانے والے ہیں۔ آن کی آن میں نیشاپور کے گلی کوچے
مشتاقانِ دید سے پُر ہو گئے۔ علماء و فضلاء، معلمین و متعلمین اور شرفائے شہر ایک جلوس کی صورت
میں آپ کے استقبال کے لئے نیشاپور سے باہر نکلے۔ لوگوں نے دیکھا آپ ایک مرکب پر رکھی
ہوئی "ہودج" میں تشریف فرما ہیں۔ اور پردے گرے پڑے ہیں۔ آپ کی سواری کے گرد ایک
ازدہام تھا جا بجا مرحبا و اہلاً و سہلاً، خوش آمدید اور نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلہ میں آپ کو شہر کے اندر پذیرائی کیلئے
رواں تھا۔ علمائے عصر یحییٰ بن یحییٰ، محمد بن رافع، اسحاق بن راہویہ اور احمد بن حارث آپ کی سواری کے
ساتھ ساتھ باگ تھامے ہوئے تھے جب یہ جلوس شہر کے مشہور "بازار چہار" میں پہنچا جہاں چو طرفہ
بازار آ کر ملتے تھے اور جہاں اپنی چھتوں پر عورتیں اور بچے آپ کے دیدار کے لئے بے چین تھے پہنچا
تو اس وقت کے دو مشہور ترین محدث ابو زرعہ اور محمد بن اسلم طوسی آگے بڑھے اور آنجنابؑ سے عرض گذار
ہوئے کہ اے سید سادات کے فرزند! اے سلالۂ طاہرہ مرضیہ اور اے خلاصۂ زاکیہ نجیبہ! آپ کو
اپنے جد طاہرہ و نفوس قدسیہ کی قسم، ان مشتاقان دید کو اپنے چہرۂ روشن و تابناک کا جلوہ دکھایئے
اور اپنی پر نور صورت کے نور سے خلق خدا کو منور کیجئے تاکہ آج مخلوق خدا آسمان اور زمین پر بیک وقت
دو آفتاب دیکھنے کا تجربہ کرے۔
حضرت امام علی رضاؑ نے جب یہ عرضداشت سنی، آپ نے اشارہ فرمایا اور ہودج کے پردے
ہٹا دیئے گئے۔ مشتاقانِ دید کی نظریں چہرۂ پُر نور کو دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ انہوں نے دیکھا گیسوانِ رسولؐ
کی مانند دو سیاہ خوشبو دار گیسو آپ کے دائیں بائیں شانوں پر پڑے ہیں۔ بے اختیار ایک اژدہام ہ

کے مرکب کے گرد جمع ہوگیا کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو حسرت کے آنسوؤں سے لبریز نہ ہو۔ کسی نے عماری کو چوما کسی نے سواری کے قدم لئے، کوئی وفور جذبات سے لباس دریدہ تھا اور کوئی ہوش و حواس سے وارفتہ۔

اسی عقیدت و خلوص کے ہنگام میں آپ سے کوئی حدیث بیان فرمانے کی گذارش کی گئی۔ اس کے فوراً بعد نیشاپور کے قاضی آگے بڑھے اور انہوں نے ہر طرف رُخ کر کے باآواز بلند کہا۔ "حاضرین خاموش ہو جائیں کہ اب امام حاضر، سبطِ پیغمبر آخر اور حامل احکام شریعتِ نبوی، اپنے اجداد سے روایت کردہ حدیثِ نبوی ارشاد فرمائیں گے۔ یہ سنتے ہی لوگ دم بخود اور گوش برآواز ہو گئے۔ آپؑ نے حدیث بیان فرمائی جسے حدیث "سلسلة الذهب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کلمة لا اله الا الله حصنی و من دخل حصنی آمن من عذابی ہ (لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا) اس حدیث کو جو لوگ آنجناب کی زبان سے سُن رہے تھے ان کا شمار ممکن نہ تھا لیکن جن حضرات نے اس حدیث کو لکھا ان کی تعداد چوبیس ہزار تھی۔

امام عالی جناب نیشاپور سے روانہ ہوئے۔ جب آپ راستہ کے ایک گاؤں "سرخ" نامی کے قریب پہنچے تو آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ ہمراہیوں نے آپ کی توجہ نماز کی طرف دلائی تو آپ رک گئے۔ سواری سے اُترے اور وضو کیلئے پانی طلب فرمایا لیکن پانی موجود نہ تھا۔ عرض کیا گیا کہ یہاں کہیں پانی موجود نہیں ہے۔ امام زمین پر بیٹھ گئے اور اپنے دست مبارک سے زمین کھودی شگافتہ جگہ سے پانی اُبلنے لگا۔ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے وضو کیا اور نماز ادا فرمائی۔ شیخ صدوق کا بیان ہے کہ اس جگہ سے ان کے اپنے زمانہ تک پانی جاری تھا۔ کچھ دیر قیام کے بعد "سرخ" سے روانہ ہوئے اور "رباط سعد" نامی بستی میں قیام کیا دوران قیام ایک شخص جس کے ہاتھ اور زبان مفلوج تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے مرض سے شفایاب ہوا۔ اخبار و آثار امام رضاؑ میں ابو احمد عبدالرحمان جو صفوان کے نام سے مشہور تھا ایک روایت بیان کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ شخص (جس نے شفا پائی) میرے قافلے میں شامل خراسان سے کرمان کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں قزاقوں کے ایک گروہ نے حملہ کیا اور اس شخص کو مالدار پا کر اپنے ساتھ لے گئے اور اسے تکلیفیں پہنچا کر اس سے اس کے خزانہ کا پتہ پوچھتے رہے۔ ایک قزاق کی بیوی نے رحم کھا کر اسے فرار کا موقع

دیدیا یہ وہاں سے بھاگ آیا مگر اس کے ہاتھوں نے کام کرنا اور زبان نے کلام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ شخص خراسان پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ حضرت امام رضاؑ نیشاپور میں قیام فرما ہیں وہ فوراً نیشاپور پہنچا تاکہ آپ کی روحانی قوت کے ذریعہ اپنے علاج میں مدد لے سکے۔ لیکن جب وہ نیشاپور پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ آپ یہاں سے جا چکے ہیں۔ اور اس وقت "رباط سعد" نامی بستی میں فروکش ہیں۔ وہ فوراً "رباط سعد" پہنچا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مدعا عرض کیا آپ نے اسے ایک عمل بتایا جس سے اس نے شفا پائی۔ اس عمل کو "عمل اُرز" کہتے ہیں۔

"رباط سعد" سے آپ نے پھر رخت سفر باندھا اور راستہ میں "سناباذ" کے مقام پر اترے۔ یہاں آپ نے حمید بن قحطبہ طائی کے گھر قیام کیا۔ ہارون رشید کی قبر اسی بستی میں واقع ہے۔ آپ ایک روز ہارون رشید کی قبر پر گئے آپ کے ساتھ بہت سے عقیدتمند تھے۔ آپ اُن سے مخاطب ہوئے اور ہارون کی قبر کے قریب اپنے ہاتھ سے نشان بناتے ہوئے کہا: "میں اس جگہ دفن ہوں گا اور ہمارے شیعہ یہاں آیا کریں گے۔" بعد میں ایسا ہی ہوا جب آپ کو انگوروں میں زہر ملا کر پیش کئے گئے وہ واقعہ اسی جگہ کا ہے اور جب آپ کی وفات ہو گئی تو یہیں مامون کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ جہاں اب شیعہ زیارت قبر جناب کیلئے جاتے ہیں۔

"سناباذ" کے مقام سے آپ رخصت ہو کر "سرخس" پہنچے۔ اخبار و آثار امام رضاؑ میں درج ہے کہ ابو النصر احمد حسین کا بیان ہے کہ جب امام رضا علیہ السلام نیشاپور میں مقیم تھے تو ان کی خدمت کیلئے میری پر دادی کو مامور کیا گیا تھا۔ اور جب آپ نیشاپور سے روانہ ہوئے تو میری دادی "سرخس" تک آپ کے ہمراہ گئی تھیں اور انہوں نے راستہ میں آپ سے ایک حدیث پوچھی تھی "سرخس" کے بعد آپ کا نزول "مرو" میں ہوا اور یہی آپ کی منزل مقصود آخر تھی۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ جب حضرت امام رضا علیہ السلام کے "مرو" پہنچنے کی خبر مامون کو ملی تو اس نے فوراً اعیان سلطنت کو طلب کیا اور حکم دیا کہ آپ کے استقبال کے لئے پوری پوری تیاری کی جائے۔ تمام امراء، منصبدار، شہر کے بزرگ، قضاۃ اور اہل دربار آپ کے استقبال کیلئے حاضر رہیں۔ جب آنجناب "مرو" کے نزدیک پہنچے تو خود مامون الرشید شہر سے باہر آپ کے استقبال کیلئے موجود تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر معانقہ کیا آپ کو بوسہ دیا اور بڑی ہی عزت و تکریم و تعظیم سے

اپنے ساتھ بٹھایا، پھر مامون نے حاضرین کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں آپ کی اور آپ کے اجداد کی فضیلت بیان کی۔ اس کے بعد اس نے ہر شخص کا امتحان لیا۔ اپنے طور پر جانچا، پرکھا اور کسی کو بھی اس قابل نہ پایا جو بارِ خلافت اٹھا سکے۔

معتبر مورخین کا کہنا ہے کہ چند روز توقف کے بعد مامون نے حضرت امامؑ سے خلافت قبول کرنے کی درخواست کی۔ لیکن آپ نے جواباً فرمایا "قسم بخدا! مجھے زہد و تقویٰ اور دُنیا سے بے رغبتی میں لطف و فخر حاصل ہوتا ہے"۔ اور مامون کی اس درخواست کو قبول نہیں کیا۔ اس پر مامون نے عرض کی اگر خلافت قبول نہیں فرماتے تو ولی عہدی ہی قبول فرما لیجئے۔ آپ نے بجبر و اکراہ ولیعہدی قبول فرمانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

ملا مبین فرنگی محلی عالم اہلسنت "وسیلۃ النجات" میں لکھتے ہیں۔

"پہلے مامون نے ارادہ کیا تھا کہ خود امر خلافت سے معزول ہو کر یہ منصب حضرت علی رضاؑ کے سپرد کر دے۔ جب اس نے اس کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا۔

"اگر خلافت آپ کو خدا نے دی ہے تو جائز نہیں کہ آپ دوسرے کے سپرد فرمائیں اور خود کو معزول کریں اور اگر خلافت آپ کا حق نہیں ہے تو آپ کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کو دیں۔

مامون نے کہا "یا ابن رسول اللہ! آپ تو میری درخواست قبول کر ہی لیجئے۔

حضرت نے فرمایا میں اپنی خوشی سے تو ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

چنانچہ دو ماہ تک یہی رد و قدح جاری رہی کہ مامون اصرار کرتا تھا اور حضرت انکار کرتے تھے آخر مامون نے کہا خلافت قبول نہیں تو ولی عہد بننا ہی منظور فرما لیجئے۔

آپ نے فرمایا "مجھے میرے والد ماجد نے اطلاع دی ہے کہ میں آپ سے پہلے مسموم ہو کر اس جہانِ فانی کو الوداع کہوں گا پھر کس طرح یہ عہدہ قبول کروں؟

بہت اصرار کے بعد حضرت نے فرمایا کہ خیر اس شرط پر ولی عہدی قبول کرتا ہوں کہ عزل و نصب کا اختیار مجھے نہ ہو گا۔

علامہ شریف جرجانی "مواقف" میں لکھتے ہیں

وہ نوشتہ جو ولی عہدی قبول کرتے وقت حضرت امام موسیٰ الرضا نے مامون کو لکھ کر دیا

یہ تھا۔

"چونکہ تم نے ہمارے ان حقوق کو تسلیم کر لیا ہے جو تمہارے آباؤ اجداد نے قبول نہ کئے تھے اسلئے میں نے ولی عہدی قبول کی، اگرچہ جفر و جامعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انجام کو نہ پہنچے گا۔"

علامہ شبلی نعمانی اس موقع پر "المامون" میں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۲۰۱ھ میں اس (مامون) نے ایک دربار جس میں تمام اعیانِ سلطنت و ارکانِ دربار موجود تھے منعقد کیا اور سب سے خطاب کر کے کہا آج دنیا میں جس قدر آلِ عباس ہیں میں ان کی لیاقت کا صحیح اندازہ کر چکا ہوں نہ ان میں اور نہ آلِ علی میں آج کوئی ایسا شخص موجود ہے جو استحقاقِ خلافت میں حضرت علی رضاؑ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کر سکے اس کے بعد اس نے تمام حاضرین سے حضرت علی رضاؑ کے لئے بیعت لی اور دربار کا لباس بجائے سیاہ کے سبز قرار دیا جو فرقہ سادات کا امتیازی لباس تھا۔" (ص ۶۷)

اس کے بعد اس نے فوج کی وردی کا رنگ بھی سبز قرار دیدیا اور تمام ملک میں شاہی احکام نافذ اور منتشر کر دیئے کہ امیرالمومنین "مامون" کے بعد حضرت علی رضاؑ تاج و تخت کے مالک ہیں اور ان کا لقب "الرضا من آلِ محمدؐ" ہے اور حسن بن سہل کے نام یہ حکم جاری کیا کہ وہ ان کے لئے بیعت عام لے۔

ان احکامات کا جاری ہونا تھا کہ بغداد میں تہلکہ مچ گیا۔ آلِ عباس پر گویا قیامتِ صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ وہ آلِ علیؑ کی طرف انتقالِ خلافت کو پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے "خلافت آلِ عباس کے دائرہ سے باہر نہیں جانی چاہیئے"۔ جونہی یہ احکام بغداد پہنچے عباسیوں نے اسی وقت مامون کی جگہ ایک نئے خلیفہ کو لانے کے منصوبہ کو تشکیل دینا شروع کر دیا اور خفیہ طور پر مامون کے چچا "ابراہیم ابن المہدی" کی بیعت کر لی اور پھر یکم محرم ۲۰۲ھ کو تمام اہلِ بغداد نے بیعت کر لی۔ ابراہیم نے اپنا لقب مبارک اختیار کیا۔ یوں اہلِ بغداد نے مامون کو معزول کر دیا۔

مامون ان ہنگاموں سے قطعی بے خبر "مرو" میں مقیم تھا۔ فضل بن سہل (ذوالریاستین) نے کوئی خبر مامون تک نہیں پہنچنے دی تھی اس نے ان خبروں کو مامون تک نہ پہنچنے کے تمام راستے

مسدود کر دیئے تھے۔ لوگ مامون کے خلاف ہو گئے تھے اور ابراہیم اب بھی حسن بن سہل سے برسرپیکار تھا۔ حضرت امام علیہ السلام کو اس تمام صورت حال کا علم تھا مگر اس میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے۔ جب آپ نے دیکھا کہ حالات خطرناک حد تک پہنچ چکے ہیں اور کسی درباری نے مامون کو آگاہ کرنے کی جرأت نہیں کی ہے تو آپ نے اپنا فرض جانا کہ مامون کو ان خطرات اور خطرناک سازش سے آگاہ فرما دیں۔ چنانچہ ایک روز آپ نے تمام حالات مامون سے بیان کر دیئے۔ طبری اور شبلی دونوں لکھتے ہیں کہ حضرت علی رضاؑ نے اس فرض کو ادا کیا اور مامون سے کہا کہ "امین کے قتل کے بعد ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا ہے کہ بغیر خونریزی کے تمام ہوا ہو، اہل بغداد ذوالریاستین کی وزارت اور آل عباس میری ولی عہدی پر سخت برافروختہ ہیں۔ ان لوگوں نے آپ کے چچا ابراہیم کی بیعت کر کے اسے اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔ ابراہیم اور حسن بن سہل میں اب بھی جنگ جاری ہے۔" یہ سنتے ہی مامون کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ ذوالریاستین کے کہنے کے مطابق اہل بغداد نے خلیفہ نہیں بلکہ انتظامی امور میں مدد کے لئے اپنا امیر اور نائب الریاست مقرر کیا ہے۔ بیعت کا نام سن کر مامون کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے کہا نہیں ایسا نہیں ہے لوگوں نے اسے جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے، نائب الریاست بنایا ہے۔ حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا "ذوالریاستین نے ملک کے اصل حالات سے آپ کو بے خبر رکھا ہے ابراہیم اور حسن بن سہل کے درمیان جنگ جاری ہے اور آپ کے خاندان کے افراد میری ولیعہدی کے اعلان پر سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب نے ابراہیم کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔ مامون سخت پریشان ہوا۔ اور اس امر کی تصدیق کے لئے آپؑ سے دریافت کیا کہ کیا اور کوئی دربار سے متعلق شخص بھی ان حالات سے باخبر ہے؟ آپ نے فرمایا "یحییٰ بن معاذ، عبدالعزیز بن عمران وغیرہ ان حالات سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ مامون نے ان لوگوں کو پیش کرنے کا حکم دیا جب یہ لوگ حاضر ہوئے تو ان سے اس نے دریافت کیا کہ وہ اس بارے میں کیا جانتے ہیں؟ یہ لوگ گھبرائے کیونکہ وہ ذوالریاستین سے خوفزدہ تھے مگر جب مامون نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ذوالریاستین ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا اور اپنے ہاتھ سے امان لکھ کر دیدی تو انہوں نے تمام حالات بلا کم و کاست مامون کے سامنے بیان

رہے۔ انہوں نے بتایا "ہرثمہ ابنی حالات کو حضور کی خدمت میں پیش کرنے حاضر
ہوا تھا لیکن ذوالریاستین نے اسے حضور کی نظر میں دشمن ظاہر کیا۔ انہوں نے یہ رائے بھی دی کہ
اگر اس کی جلد تلافی نہ کی گئی تو خلافت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ اس کے بعد ان لوگوں نے مامون کو
دارالخلافہ بغداد میں پہنچنے اور وہاں مقیم رہنے کی رائے دی۔ مامون بغداد جانے کے لئے فوراً
تیار ہو گیا۔ جب ذوالریاستین کو مامون کے اس ارادہ کا علم ہوا تو وہ فوراً تاڑ گیا کہ کن لوگوں نے
یہ خبر مامون تک پہنچائی ہے۔ چنانچہ اس نے انہیں سزائیں دیں۔ کسی کو قید کیا۔ کسی کو کوڑے
لگوائے اور کسی کی ڈاڑھی اکھڑوائی۔ ان ناروا سزاؤں کی شکایت جب حضرت امام رضاؑ نے
مامون سے کی تو مامون نے جواب دیا "میں اس سے غافل نہیں ہوں مگر مناسب تدبیر سے
کام لینا چاہتا ہوں" اور اُس نے جو مناسب تدبیر کی اس کے نتیجے میں ایک روز ذوالریاستین
کو حمام میں قتل کر دیا گیا۔ قتل کے دن مامون "سرخس" پہنچا تھا۔ قاتل چار اشخاص تھے اور یہ
چاروں مامون کے خاص خدمت گار تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ یہ قتل مامون نے کرایا ہے لیکن
اس نے پردہ پوشی کے لئے قاتلوں کی گرفتاری پر دس ہزار اشرفیاں انعام مقرر کرنے کا اعلان
کیا اور جب قاتل گرفتاری کے بعد مامون کے سامنے پیش کئے گئے تو انہیں قتل کرا دیا گیا۔ شبلی
نعمانی نے "المامون" میں لکھا ہے کہ جب مامون نے ان قاتلوں سے سوال کیا کہ "تم نے یہ
قتل کس کے ایما سے کیا؟ تو ان کا یک زبان ہو کر یہ جواب تھا کہ "آپ ہی نے تو یہ حکم ہمیں
دیا تھا" بعد میں ان لوگوں کو بھی تلاش کر کے بلوایا گیا جن پر اس سازش کے علم کا شبہ تھا اگرچہ
انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن ان کو بھی براہِ احتیاط قتل کا حکم دیا گیا۔ اور یوں مامون
نے اس یقین کو مختلف تدبیروں سے شک و شبہ میں تبدیل کر ڈالا۔ انہی تدابیر میں سے
ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ اس نے قاتلوں کے سر مقتول کے بھائی حسن بن سہل کے پاس بھجوائے
اور تعزیت نامہ میں بہت کچھ رنج و غم ظاہر کیا۔ اسے فضل بن سہل ذوالریاستین کی جگہ
منصب وزارت پر مامور کیا اور اس کی ماں کے پاس تعزیت کے لئے خود گیا اور اس سے کہا:
کہ "اب فضل کی جگہ میں آپ کا فرمانبردار فرزند ہوں"۔ جس پر فضل کی ماں نے یہ الفاظ ادا کئے "میں ایسے بیٹے
کا غم کیوں کروں جس نے میرے لئے تم جیسا فرزند چھوڑا"۔ اس جملے میں طنز کی جھلک موجود ہے۔

حضرت امامؑ کی شہادت، قاتِل کا سُراغ

مامون رجب ۲۰۲ھ میں "مرو" سے بغداد کی طرف روانہ ہوا، اور صفر ۲۰۴ھ میں بغداد پہنچا تھا۔ ایک سال سات ماہ کی یہ مدت اس سفر میں اس لئے صرف ہوئی کہ مامون نے اس سفر کو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ملکی دورہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ "مرو" سے جو سطابران میں تھا۔ بغداد تک راہ میں آنے والے ہر شہر او قصبہ میں قیام کرتا گردو نواح کے سیاسی حالات دیکھتا ضروری احکام صادر کرتا اور اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتا۔ بظاہر ملکی حالات معلوم کرنے کے اس بہانہ میں اس کا ایک سیاسی مقصد یہ تھا کہ اس کی روانگی کی اطلاع پہلے ہی بغداد میں پہنچ چکی تھی اور اس اطلاع سے اہل بغداد میں اختلاف و انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ بیشتر اہل بغداد جانتے تھے کہ جب تک مامون بغداد سے دُور رہے اسی وقت تک ابراہیم کی خلافت ہے۔ چنانچہ جوں ہی مامون کے بغداد آنے کی خبر مشہور ہوئی لوگ ابراہیم کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ بغداد پہنچنے کی مدت میں طول دینے کا سبب دراصل یہی تھا۔ مامون جوں جوں بغداد سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا لوگ کسی نہ کسی بہانے ابراہیم سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ "مطلب" نے بیماری کا بہانہ کیا اور مدائن سے بغداد پہنچا اور یہاں آکر خفیہ طور پر مامون کی بیعت لوگوں سے لینے لگا۔ لطف کی بات یہ کہ خود ابراہیم کے بھائی منصور بن مہدی نے سب سے پہلے بیعت کی۔ علی بن ہشام اور حمید بھی بغداد آگئے۔

ابراہیم کے جنگی افسر عیسیٰ بن محمد بھی حسن بن سہل سے جا ملا۔ جس سے ابراہیم مصروف جنگ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر تمام بغداد ابراہیم کا مخالف ہو گیا۔ ابراہیم کے عامل نکال دیئے گئے۔ اور حمید کو آکر بغداد ان کے سپرد کر دیا۔ "یاسریۃ" کے مقام پر جمعہ کے دن خطبہ میں مامون کا نام لیا گیا اور

ابراہیم کو معزول کر دیا۔

یہ تمام خبریں مامون کو پہنچ رہی تھیں وہ اب کے ساتھ ہی دوسرا سیاسی مقاصد بھی بڑے اطمینان سے حاصل کر رہا تھا اور وہ مقصد تھا خلافت کی راہ سے رکاوٹوں کو اس طرح دُور کرنا کہ لوگوں کو مامون کے خلاف شبہ تک نہ ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون نے اپنی ایک بیٹی "اُمِ حبیبہ" کی شادی امام علی رضاؑ سے اور دوسری بیٹی "ام الفضل" کی شادی محمد بن علی بن موسیٰ سے کر دی تھی لیکن یہ کوئی عجوبہ بات نہ تھی یہ بنی ہاشم کا ایک ہی خاندان تھا بیٹی لینا یا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی اسی کے ساتھ حضرت امام علیؑ رضا کو ولی عہد قرار دینے کا مسئلہ البتہ اس لئے تھا کہ مامون کے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی سادات اور علویوں کی جانب سے خروج کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس تدبیر سے اس کا خیال تھا کہ یہ بدامنی اور خونریزی جو اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے موقوف ہو جائے۔ اور وہ اس دوران موقع دیکھ کر انہیں خاموشی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دے اور یہ کہہ دے کہ امام کے بعد اب سادات، علویین اور بنی عباس میں کوئی اس قابل ہے ہی نہیں اس طرح علوی مطمئن ہو جائیں گے اور خلافتِ عباسیہ متوازن و پُرامن ہو جائیگی لیکن تینتیس ۳۳ ہزار عباسیوں کو اس کے اس منصوبے کے اندرون کا چونکہ علم نہ تھا اس لئے عباسی بھڑک اٹھے اور انھوں نے ابراہیم کو خلیفہ بنا کر مامون کے خلاف بغاوت کر دی جس سے حالات بد سے بدتر یکہ بدترین صورتِ حال کو پہنچ گئے۔

جب مامون کو حضرت امامؑ سے بغداد کے حالات کا علم ہوا، ابراہیم کے خلیفہ ہونے کا پتہ چلا اور باخبر عینی شاہدوں نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فضل بن سہل ذوالریاستین کو ان حالات سے بے خبر رکھنے کا مجرم ظاہر کیا تو مامون کو یقین ہو گیا کہ اس خلفشار کا سبب امامؑ کی ولیعہدی کے ساتھ ساتھ فضل کی غداری بھی ہے۔ اس نے اسی وقت بغداد جانے کا ارادہ کیا اور دورانِ سفر اپنے اس سفر کو طول دیکر ان دونوں اسباب کے ازالہ کی تدبیریں کرنے لگا۔ وہ جس وقت اپنے دورانِ سفر "سرخس" میں مقیم تھا اس وقت اس کے جائے مقام سے دُور، فضل بن سہل ذوالریاستین کو مامون کے خفیہ حکم پر حمام میں گھس کر قتل کر ڈالا۔ گرفتار ہونے پر قاتلوں نے مامون کا نام لیا۔ چونکہ حضرت امام علی رضاؑ اس سفر میں اس کے ہمراہ تھے اس لئے

وہ دُور سفر میں رہ کر کسی ایسی تدبیر پر عمل کرنے سے قاصر تھا اس لئے اس نے ایک دوسری تدبیر پر عمل کیا اور جب آپ مامون کے ہمراہ طوس پہنچے تو آپ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ جو اس وقت "سناباذ" کہلاتا تھا۔ یہیں ہارون رشید کی قبر ہے اور اسی سبب سے مامون یہاں ٹھہرا تھا۔ مامون نے حکم دیا کہ اس کے باپ ہارون کی قبر میں حضرت امام کو دفن کیا جائے تاکہ ہارون حضرت امام کی برکت سے مستفید ہو۔ بعد میں محبّ اہلبیت ایک شاعر "دعبل" نے اپنے اشعار میں لکھا ہے۔

> "طوس میں دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر لوگوں کیلئے بہترین ہے۔ اور عجب بات یہ ہے کہ ناپاک قبر کے آدمی کو پاک قبر کے قرب سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور پاک قبر کے آدمی کو ناپاک قبر سے کوئی نقصان نہیں ہوتا" (یہاں ناپاک سے ہارون اور پاک سے حضرت امامؑ کی قبر مُراد ہے۔")

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس وقت جو دیکھا لکھا ہے کہ ہارون رشید کی قبر حضرت امام رضا کی پائنتی بنی ہوئی ہے۔ لوگ جوق در جوق آپؑ کی قبر کی زیارت کو آتے ہیں تو ہارون کی قبر پہ لات مارتے ہیں۔

علامہ شبلی "المامون" میں لکھتے ہیں کہ مامون نے حضرت علی رضاؑ کی وفات پر انتہائی غم و رنج کا اظہار کیا وہ آپؑ کے جنازے کے ساتھ ننگے سر رہا اور رو رو کر بار بار کہتا تھا "اے ابو الحسن! تیرے بعد میرا کیا ہوگا۔ میں اب کہاں جاؤں؟ تین روز تک قبر پر مجاور کی حیثیت سے رہا اور ان تین دنوں میں اس نے نمک کے ساتھ ایک روٹی کے سوا اور کچھ نہ کھایا" (ص ۸۲)

امام عالی مقام کا قاتل کون ہے؟

تاریخی اعتبار سے آج تک یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ حضرت امام علی رضاؑ کا قاتل کون تھا؟ بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن تاریخ کے لبوں پر آج بھی یہ "جواب طلب سوال" موجود ہے کہ غیر جانبدار مورخین بھی قاتل کے تعین میں خاموش کیوں رہے؟ وہ اس امر میں واضح

اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ آپ کی وفات ایک موقع پر انگور کھانے کے فوراً بعد واقع ہوئی اور ان انگوروں میں یقیناً زود اثر زہر کی آمیزش تھی۔ یہ زہر کس نے ملایا تھا اس شخصیت کے تعین میں مورخین ہمیشہ گریز سے کام لیتے رہے ہیں یہ گریز بھی جبری والتزامی معلوم ہوتا ہے اس موضوع پر اُن کے تحقیقی مباحث کچھ ایسا اظہار کرتے ہیں جیسے وہ کسی چیز کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہوں۔ اس صدی کی ابتدا اور ہمارے زمانے کے قریب ترین مورخ و محقق علامہ شبلی نعمانی بھی اپنی کتاب "المامون" میں اسی مختصر تحقیقی بحث میں گریز پائی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

"جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایک مورخ نے بھی مامون پر یہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کی ہے" بلکہ علامہ ابن اثیر نے صاف الفاظ میں اس غلط خیال پر استعجاب ظاہر کیا ہے" (المامون ص۸۴)

اس غلط خیال پر کہ امام کو زہر مامون نے دیا تھا" بقول علامہ شبلی نعمانی" جہاں تک علامہ ابن اثیر کے استعجاب کا تعلق ہے تو علامہ مذکور کی وہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری البتہ علامہ شبلی کے اس خیال سے متعلق "سید محسن مظفر صاحب اپنی تازہ تحقیقی کتاب "سیرت الامام علی بن موسیٰ الرضا" کے ص۲۰ پر لکھتے ہیں۔

"ان (شبلی نعمانی) کے خیال و دعویٰ کے مطابق کسی ایک مورخ نے بھی یہ الزام مامون پر عائد کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ابن اثیر نے تو صاف صاف لفظوں میں اس پر استعجاب کا اظہار کیا ہے"

موصوف آگے چل کر مزید لکھتے ہیں۔

"ابن اثیر کی حیرت و استعجاب کا اس کی تاریخ میں کوئی پتہ نہیں ملتا۔ ابن اثیر نے تو اپنی تاریخ میں ۲۰۳ھ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" اسی سنہ میں علیؑ بن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے انتقال فرمایا۔ ان کی موت کا سبب انگور تھے جو انہوں نے کھائے تھے۔ یہ انگور تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ان کا انتقال اچانک ہوا۔ یہ صفر کے آخری ایام کی بات ہے۔ آپ نے

طوس میں انتقال کیا۔ مامون نے آپ کی نماز پڑھائی اور آپ کو
رشید کے پاس دفن کیا۔ جب انہیں دفن کیا جا رہا تھا تو مامون اپنے
والد کی قبر کے پاس کھڑا تھا۔" کہا جاتا ہے کہ مامون نے آپؑ کو
انگوروں میں زہر دیا تھا اور انگور آپ کو بہت پسند تھے۔"

(کامل فی التاریخ جلد۶ ص۳۵۱ بحوالہ سیرۃ الرضاؑ)

ابن اثیر کی تاریخ کے مندرجہ اقتباسات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ابن اثیر نے نہ تو اس خیال کو کہ امام کیلئے انگوروں میں زہر مامون نے ملوایا غلط قرار دیا ہے اور نہ ہی اس خیال پر تعجب کا اظہار کیا ہے جبکہ علامہ شبلی نعمانی اس خیال کو غلط اور موجب استعجاب قرار دے رہے ہیں اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی کا لاشعور بھی جبر و گریز کے اثرات میں تھا۔ یہ بات ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں ابن اثیر نے "کہا جاتا ہے" استعمال کیا ہے یقین کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اور وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ وہ واقعہ کے عینی شاہد نہیں تھے اور نہ ہی کسی عینی شاہد کی کوئی روایت دستیاب تھی۔ ایسے موقع پر تاریخی اصولِ تحقیق اس شہرت کو اہمیت دیتے ہیں جو کسی واقعہ سے متعلق زبان زدِ عام ہو۔ چنانچہ مورخ ابن اثیر نے تاریخ کے اسی اصول سے کام لیا اور اس اہم امر کی اطلاع "کہا جاتا ہے" کہہ کر ہم تک پہنچا دی۔ اس سے یہ بات بآسانی ثابت ہو جاتی ہے کہ ابن اثیر کے زمانہ تک یہ بات شدت سے مشہور تھی کہ امام علی رضاؑ کو مامون نے زہر دیا تھا اسکے برعکس یعنی زہر خورانی سے مامون کی لاتعلقی، شہرت کی حامل ہرگز نہیں تھی۔

اس کے بعد علامہ شبلی اسی ذیل میں مزید لکھتے ہیں۔

"مامون رشید کے زمانہ سے نہایت قریب تاریخ جو آج دستیاب ہو سکتی ہے۔ ابن واضح عباسی کی تاریخ ہے۔ یہ مصنف مامون رشید کے زمانہ کے واقعات ان لوگوں کی زبانی روایت کرتا ہے جو خود مامون کے عہد میں موجود تھے۔ ہم اس کی تاریخ میں شیعہ پن کے اثر بھی پاتے ہیں۔ تاہم اس نے مامون کے بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی نسبت کی ہے۔" (ایضاً)

علامہ شبلی نے اپنے اس بیان میں عہد مامون سے قریب جس تاریخ کا ذکر کیا ہے، انہوں نے اس کے مورخ "ابن واضح" کا عباسی ہونا بھی تسلیم کیا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ مولانا شبلی

جو خود ایک مورخ اور محقق ہیں اور تاریخی اصول تحقیق سے واقفیت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں وہ کس طرح ایک عباسی مورخ کی، مامون کے بجائے علی بن ہشام کی نسبت اس "بدگمانی" پر یقین کرتے ہیں۔ بنی عباس جو علویوں کے مخالف ہوں، سادات سے دشمنی رکھتے ہوں، جو ان کی امامت کو ایک لمحہ برداشت نہ کر سکتے ہوں اور جو صرف اس لئے مامون سے ناراض ہو جائیں کہ اس نے سادات کے ایک فرد وقت کے امام حضرت علی رضا کو ولی عہد کیوں بنایا؟ اور جب ان حالات سے پریشان ہو کر مامون خود حضرت امام کو زہر دلا کر بنی عباس کو خوش کرنے کا سامان مہیا کرے تو کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک عباسی مورخ عباسی خلیفہ کو قتل کے جرم سے بچانے کی کوشش نہ کرے؟ بقول علامہ شبلی: اس نے مامون کے بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی طرف پھیر دی ہے لیکن نہ تو خود اس نے اس ضمن میں کوئی ثبوت پیش کیا ہے۔ ورنہ ہی اس کی تائید میں علامہ صاحب نے کوئی حوالہ دیا ہے۔ جبکہ مامون کے خلاف بدگمانی کیلئے متعدد تاریخی شواہد اڑکتے نظر آتے ہیں۔ علامہ صاحب نے ابن واضح عباسی کی بدگمانی پر یقین کیلئے صرف ایک یہ بات ضرور لکھی ہے کہ "یہ مصنف مامون کے زمانہ کے واقعات ان لوگوں کی زبانی روایت کرتا ہے جو خود مامون کے عہد میں موجود تھے"۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ یہ راوی مامون کے عہد ہی کے تھے لیکن یہ کس نے ثابت کیا ہے کہ وہ عینی شاہد بھی تھے۔ ان کی روایتیں بھی خیالی سنی سنائی اور قیاس پر مبنی تھیں۔ قریب ترین شخص بھی اس سازش کے حقائق سے آگاہ نہ تھا اس سے پہلے ذوالریاستین کے قتل کی سازش میں، چونکہ مجرموں نے گرفتاری کے بعد راز فاش کر دیا تھا اس لئے مامون نے اس سازش میں نہ تو ایسا کوئی التزام رکھا، نہ ملزموں کی گرفتاری پر انعام کا اعلان کیا۔ اس طرح یہ سازش بغیر افشاں ہوئے مامون کے گرد گھومتی رہی۔ سازش کے یہ محکوم کارکن یہ مجال ہی نہ رکھتے تھے کہ وہ اس وقت یا اس کے بعد اپنے منہ سے کوئی لفظ نکال کر اپنی موت کو دعوت دیتے۔

اس کے بعد علامہ شبلی قاری کے ذہن کو مزید نرمی کی طرف راغب کرنے کے لئے لکھتے ہیں "مامون نے حضرت علی رضا کو ولی عہد خلافت مقرر کیا تو اس سے اس کی کوئی سازش مقصود نہ تھی حضرت علی رضا کوئی ملکی شخص نہ تھے اور نہ ان سے حکومت عباسیہ کو کسی خطرہ کا احتمال تھا۔ جیسا کہ شیعوں کا دعویٰ ہے"۔ (المامون صفحہ ۸۴)

یہاں علامہ صاحب نے ولی عہدی کی سازش اور ولی عہدی کے بعد حکومت عباسیہ کو پیش آنے والے عظیم خطرہ سے واقف و باخبر ہوتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کی ہے وہ خود لکھتے ہیں۔

> حسن بن سہل کے نام بھی فرمان گیا کہ ان "امام رضاؑ" کیلئے بیعت عام لی جائے اور عموماً اہل فوج اور عمائد بنی ہاشم سبز رنگ کے پھریرے اور سبز کلاہ و قبائیں استعمال کریں، اس انوکھے حکم نے بغداد میں ایک قیامت انگیز ہلچل مچا دی اور مامون سے مخالفت کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا بعضوں نے بجبر اس کے حکم کی تعمیل کی مگر عام صدا یہی تھی کہ "خلافت خاندان عباس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی"۔

(المامون صد ۷۶)

علامہ شبلی خود یہ الفاظ لکھنے کے باوجود کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ "ان سے حکومت عباسیہ کو کسی خطرہ کا احتمال نہ تھا اگر فرض کر لیا جائے کہ اس وقت خطرہ کا احتمال نہ تھا تو ولی عہدی کے اعلان کے بعد تو خطرہ اپنی تمام تر سنگینی اور خوفناکی کے ساتھ سامنے آن کھڑا ہوا تھا اور یہ ثابت ہے کہ زہر خورانی کا واقعہ اس خطرہ کے وجود کے بعد واقع ہوا ہے۔ لہٰذا یہ یقینی امر ہے کہ خطرہ کے موجود ہونے پر یہ سازش تیار کی گئی اور بغداد میں داخلہ سے قبل اس پر عمل کر لیا گیا۔ جس طرح بنی امیہ اور ان سے پہلے کے لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ "اگر خلافت بنی ہاشم میں ایک بار چلی گئی تو پھر قیامت تک نہیں لوٹے گی اسی طرح بنی عباس کہا کرتے تھے کہ "اگر خلافت ایکبار آل ابی طالب میں منتقل ہو گئی تو قیامت تک واپس نہ آئے گی۔

اسی مضمون سے متعلق کچھ اشعار مورخ مسعودی نے اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں نقل کئے ہیں ان ہی میں سے ابراہیم ابن المہدی عباسی کے یہ ۲ اشعار قابل غور ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

(۱) حکومت کی پگڑی بنی عباس کے سر سے اتار کر بنی علیؑ کے سروں پر باندھ دی گئی ہے۔

(۲) بنی عباس چیخ اٹھے ہیں کہ یہ دستار ایسے سروں پر نہ باندھی جائے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا ان سے مطالبہ کرتے ہیں۔

ان اشعار سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دستار حکومت میراث رسول کے طلبگار یعنی آل ابی طالب

کے سرحوں تک شب بچیپی جا بیٹے۔ پھر اسی ابراہیم بن مہدی عباسی کے بغداد میں خلیفہ ہونے کے اعلان کے بعد فضل بن سہل اور امام رضاؑ کے خلاف سازش پر عمل کیا گیا۔ اور اس کے بعد مامون نے اہل بغداد کو خط لکھا کہ "اب کیا چیز ہے جس کی تم شکایت کر سکتے ہو؟" یعنی جو غلطی میں نے کی تھی اس کا ازالہ کر دیا گیا اب کوئی وجہ نہیں کہ تم مجھ سے برگشتہ رہو۔

ہم اس بارے میں صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ "مامون" علامہ شبلی نعمانی کا پسندیدہ "ہیرو" ہے اور کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا "ہیرو" مجرم و قاتل ثابت ہو۔ علامہ موصوف نے جب "نامور فرمانروان اسلام" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا تو خاندان بنی عباس سے "مامون" ہی کو "نامور فرمانروائے اسلام" قرار دیا اور اس کے حالات پر مبنی ایک کتاب "المامون" لکھی لیکن مامون کو زہر خورانی کے الزام سے بری قرار دینے کے لئے انہوں نے صرف ایک صفحہ لکھا ہے اور وہ بھی بلا دلیل ہے۔ اگر ان کے پاس مامون کی برئیت میں با تحقیق مدلل مواد ہوتا تو وہ کئی صفحات پر مشتمل اپنا زور قلم صرف کرنے سے کبھی نہ ہچکچاتے۔

عرب میں زہر خورانی کی ابتداء

اسلام سے پہلے جاہل عرب قصاص یا انتقام لینے اور دشمن کو اپنے راستہ سے ہٹانے کیلئے کھلم کھلا تلوار کا استعمال کرتے تھے اگر قبیلہ یا فرد، انفرادی قوت میں زیادہ قوی اور فن حرب میں یکتا ہوتا تو علی الاعلان دوبدو مقابلہ کرتا اور پھر انتقام در انتقام کا سلسلہ برسوں جاری رہتا۔ اگر قبیلہ کمزور ہوتا تو شب خون پر اکتفا کرتا۔ اور اگر فرد کمزور فن حرب سے ناواقف ہونے کے ساتھ ساتھ اسے قصاص کا خطرہ لاحق رہتا تو وہ تاک میں لگا رہتا۔ رات کی تاریکی میں یا پھر سوتے ہوئے دشمن پر حملہ کر کے قتل کر دیتا اس طرح قاتل کی عینی اور یقینی نشاندھی نہ ہونے کے سبب وہ قصاص سے بچا رہتا چنانچہ ایسی بے شمار حکایتیں جاہلیت کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔ اسلام میں نماز مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی۔ نماز ایک ایسی حالت ہے جس میں نمازی نہ تو دائیں بائیں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی وہ دفاعی حالت اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان جاہل عربوں نے مسلمان ہو جانے کے باوجود نماز کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا۔ دو خلیفۂ راشد اسی حالت نماز میں حملہ آور کی تلوار کا

نشانہ بنے۔ زبیر بن عوام کو نماز کی حالت میں شہید کیا گیا تھا۔

زیاد ابن سمیہ کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ بن زیاد بصرہ کا والی مقرر ہوا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے بصرہ کی حکومت کے دوران نماز پڑھتے ہوئے لوگوں کو قتل کرایا۔

ابو بلال ایک زاہد و عابد دنیا سے بے رغبت بزرگ تھے۔ حضرت علیؓ سے رغبت رکھتے تھے۔ صفین کے معرکہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ ایک بار عبداللہ بن زیاد نے خارجیوں کے ساتھ ابو بلال کو بھی قید میں ڈال دیا۔ ابو بلال کی عبادت و ریاضت کو دیکھ کر چالیس قیدی آپ کے ہم خیال ہو گئے۔ ابو بلال عبداللہ بن زیاد کے ظلم و ستم کے سخت مخالف تھے۔ ابو بلال نے خروج کیا۔ ابن زیاد نے اسلم بن زرعہ کو دو ہزار کے لشکر سے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ اس نے شکست کھائی تو ابن زیاد نے عباد بن اخضر کی چار ہزار جمعیت کے ساتھ بھیجا۔ جنگ ہوئی۔ جنگ نے طول کھینچا اور عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ ابو بلال نے نماز کی اجازت چاہی عباد نے جنگ روک دی۔ دونوں فریق نماز میں مشغول ہو گئے لیکن عباد کے سپاہیوں نے نماز جلد ختم کی اور ابو بلال کے ساتھیوں پر اس وقت حملہ آور ہوئے جب وہ نماز میں ابھی مصروف تھے۔ ایک ساتھی بھی زندہ نہ بچا۔

ایسے طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے تھے تاکہ قاتل کی اصل نشاندہی نہ ہو سکے اور قصاص سے جان بچ جائے یوں دیت پر معاملہ ختم ہو جاتا تھا۔ ہجرت نبوی کی رات ابوجہل نے یہی منصوبہ پیش کیا تھا کہ ہر قبیلے کا نوجوان محمدؐ پر تلوار چلائے تاکہ یقینی قاتل کی نشاندہی نہ ہو سکے ہر ایک سے قصاص لینا بنی ہاشم کی طاقت سے باہر ہے لہٰذا معاملہ دیت پر ختم ہو جائے گا۔

قاتلانہ حملہ خواہ تاریکی میں، اچانک بے خبری میں، سوتے ہوئے یا نماز کی حالت میں کیا جاتا بہرحال اکثر اوقات قاتل شناخت کر لیا جاتا تھا۔ اس لئے مجرمانہ ذہنیت کے حامل لوگوں نے ایسے حربے کا سراغ لگایا جو ان مقصد میں تو فیصلہ کا یقینی حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکے اور یہ حربہ زہر کا حربہ تھا جو نہ تو تیر اور تلوار کی طرح قاتل کے ہاتھ میں دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے خون بہتا ہے جس کے چھینٹے قاتل کے دامن یا آستین پر دیکھے جا سکیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں یعنی کوئی ۳۵ھ کے بعد اس حربہ کا باقاعدہ استعمال کیا گیا اور کوئی قاتل کبھی گرفتار نہ کیا جا سکا۔

طریقہ زہر خورانی کی دریافت اور اُس کے کامیاب استعمال کی ابتداء دورِ اسلامی میں حاکم شام معاویہ بن ابوسفیان بن حرب بن اُمیہ نے کی اور اس کا پہلا نشانہ حضرت علی کے مقرر کردہ عامل مصر مالک اشتر نخعی بنے۔ جنہیں مدینہ سے مصر جاتے ہوئے شہد میں زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔ اس کے بعد معاویہ نے امام حسنؑ بن علیؑ کو ان کی بیوی "جعدہ بنت اشعث" کے ذریعہ رشوت اور ولی عہد یزید سے شادی کا لالچ دے کر شہید کرایا۔

علامہ جرجی زیدان نے تسلیم کیا ہے کہ معاویہ کے پاس اپنی حکومت کو مضبوط رکھنے کے لئے دو بڑے ہتھیار تھے۔ ایک روپیہ دوسرے زہر۔ (تمدن اسلام حصہ اول ص۹)

یہ کامیاب اور بے خطر طریقہ کمزور نہیں بلکہ قوی تر حاکم و جابر، خلیفہ اور شہنشاہ اس وقت استعمال کرتے تھے جب انہیں کسی کو قتل کرنے سے بغاوت، تخت سے دستبرداری یا خود اپنے قتل ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ ائمہ سادات کو اسی کامیاب، خاموش اور خفیہ حربہ سے ایسے ہی خطرات کے پیش نظر اپنے وقت کے خلیفہ شہید کرتے رہے۔ زہر دینے والا ہر وقت دیکھا نہیں جاتا، زہر کچھ دیر بعد اثر کرتا ہے اور خاموشی سے موت واقع ہو جاتی ہے اسے بیماری یا طبعی موت کا نام بھی بآسانی دیدیا جاتا ہے اور اس طرح شکوک و شبہات کا دائرہ وسیع کر کے قاتل کی نشاندہی پیچیدہ اور دشوار بنادی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں موت کا اصل سبب معلوم کرنے کے سائنسی ذرائع، موجود نہیں تھے۔

قصاص عرب قبائل میں بھی رائج تھا اور مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کیا جاتا تھا لیکن وہ یہ چالاکی بھی کرتے تھے کہ قاتل کو حوالے کرنے کے بجائے مقتول کے ورثاء کو دیت لینے پر مجبور کرتے تھے ایک دیت دس اونٹوں کے برابر تھی۔ یہ مالدار کیلئے چنداں مشکل نہ تھی۔ اگر ورثاء دیت لینے پر رضامند نہ ہوتے اور قصاص پر اصرار کرتے تو وہ اصل قاتل کی جگہ کسی غلام کو بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے عرب قبائل کے اس سرمایہ دارانہ طریقہ کو یکسر ختم کر دیا۔ اور قصاص کو فرض قرار دیتے ہوئے قرآن نے واضح الفاظ میں حکم دیا کہ "آزاد کے بدلہ میں آزاد اور غلام کے بدلے میں غلام ہی قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا" اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ حاکم، مقتدر، سرمایہ دار یا خلیفہ کسی کو بے گناہ قتل کرے اور قصاص سے بچ جائے۔ یہی سبب تھا کہ ایسے مواقع پر ان

لوگوں نے تلوار کی جگہ زہر سے کام لیا اور مامون نے بھی ایسے ہی حالات کے تحت حضرت امام رضا علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کرایا تھا۔

حضرت امام علیہ السلام کو کیوں؟ اور کس کے ایماء پر زہر دیا گیا؟

اس امر پر تقریباً تمام جدید و قدیم مورخ متفق الرائے ہیں کہ امام علیہ السلام کو انگور بہت پسند تھے۔ جب آپ مامون کے ہمراہ طوس پہنچے اور وہاں مامون نے اپنے باپ ہارون رشید کا مزار ہونے کی وجہ سے قیام کیا۔ دورانِ قیام ایک بار مامون کی موجودگی میں آپ کو انگور پیش کئے گئے ان انگوروں میں زہر شامل تھا کیونکہ انگور کھانے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہو گئی۔ مسعودی، ابنِ اثیر، ابن خلدون، طبری، ابن طباطبا، محمد بن طلحہ اور شبلنجی نے اپنی تاریخوں میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ یہ امر طے ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ تحقیق طلب رہتا ہے کہ آپؑ کو زہر کیوں دیا گیا اور کس نے دیا؟ بعض محققین نے زہر خورانی کا شبہ مامون پر کیا ہے لیکن وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے ہیں۔ بعض مامون کو اس سے بری قرار دیتے ہیں لیکن وہ بھی کسی مشکوک شخصیت کو پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس لئے اس الزام کی مورد صرف مامون کی ذات رہ جاتی ہے۔ اور اب ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ کیا اس وقت ایسے اسباب موجود تھے جن کی بنا پر مامون اس اقدام پر مجبور ہوا اور یہ کہ کیا واقعی زہر خورانی کا عمل مامون ہی کے ایما سے واقع ہوا؟

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں اور ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مامون اہلبیتؑ سے محبت و رغبت رکھتا تھا اور ان حقائق سے انکار نہیں کرتا تھا جو تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے گزر چکے تھے۔ وہ حضرت علیؑ کو تمام صحابہ پر فضیلت دیتا تھا اور اس ضمن میں وہ علی الاعلان بھرے دربار میں مناظرہ کر چکا تھا۔ اس مناظرہ کا ذکر علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب "المامون" میں قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ مامون کا دعویٰ تھا کہ تمام صحابہ میں حضرت علیؑ افضل ترین ہیں۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کے ساتھ جس کے سامنے اچھے اچھے عالم و فقیہہ مات کھا جاتے تھے۔ مزید چالیس بڑے بڑے فقیہہ اس دعوئ کے مخالف تھے ادھر مامون تنہا سب کے مقابلہ میں تھا۔ صبح سے دوپہر تک یہ مناظرہ جاری رہا دونوں جانب سے دلائل پیش کئے جاتے رہے۔ علامہ شبلی آخر میں لکھتے ہیں۔

"مگر انصاف یہ ہے کہ میدان مامون کے ہاتھ میں رہا، یہ پورا مناظرہ تھا۔"

العقدۃ" میں مذکور ہے اور حق یہ ہے کہ مامون کی وسعت نظر، جودت ذہن، کثرت معلومات، حسن بیان اور پرزور تقریر کا ایک حیرت انگیز مرقع ہے۔" (المامون صہ ۱۸۱)

وہ یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ خلافت اہلبیت کا حق ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا یہ حق کس طرح آل عباس کو منتقل ہوا، اور وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ عوام کی کثیر تعداد نے بنو امیہ کے خلاف اسی حق کو دلانے کے لئے سادات اور علویوں کا ساتھ دیا تھا اور اب اسے یہ بھی اچھی طرح علم تھا کہ یہ لوگ اب بھی اس حق کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور آئندہ بھی اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہ ایسے تاریخی اور آنکھوں دیکھے واقعاتی حقائق تھے جن سے وہی لوگ انکار کر سکتے تھے جو دشمن اہلبیت تھے[1]، وہی تجاہل عارفانہ سے کام لیتے تھے جو عقائد کا اختلاف رکھتے تھے[2] یا پھر وہ اس سے صرف نظر کرتے تھے جو اس حق پر قابض تھے اور یہ حق دینا نہیں چاہتے تھے۔ جیسے بنو عباس۔ لیکن مامون، جو اس ضمن میں اپنے بزرگوں کی زندگی کے تلخ تجربات سے واقف تھا۔ ان حقائق کا علی الاعلان اعتراف کرنے کے باوجود خلافت کو پرامن حالت میں اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح علویوں اور سادات کو اپنے حق میں پرامن رہنے پر رضامند کرے گا۔ اور جب ان کو معاشی و معاشرتی حقوق ملنے لگیں گے تو وہ سیاسی حقوق کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسے اس منصوبہ میں ذرہ برابر کامیابی نہیں ہوئی۔ امین کے قتل کے بعد جو سیاسی خلفشار پیدا ہوا اس سے علویوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سب سے پہلے ابو عبداللہ المعروف ابن طباطبا نے خروج کیا۔ بعد میں "ابو السرایا" ان سے مل گیا۔ اس نے طباطبا کے ہاتھ پر بیعت کر لی وہ کئی شہروں پر چڑھ گیا شکستیں دیں اور خزانے لوٹ لئے، ابن طباطبا دریا کی جانب سے اور ابو السرایا خشکی کی طرف سے کوفہ کی طرف بڑھا۔ کوفہ کے صدر مقام "قصر العباس" اور کوفہ پر قبضہ کر لیا اور عباسیوں کے مکانات تباہ کر دیئے۔ حسین ابن الحسن نے مکہ پر دھاوا بول دیا۔ علامہ شبلی اس

---

[1] جیسے بنو امیہ۔ [2] جیسے اہل سنت

موقعہ پر لکھتے ہیں۔

> "سادات جو خلافت کو اپنا ازلی حق سمجھتے تھے ہمیشہ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے ہر طرف اٹھ کھڑے ہوئے اور تمام ملک کو ہلاکر رکھدیا"۔
> (المامون صہ ۱۵۱)

ظاہر ہے ان حالات میں مامون کے شب و روز کس ہیجان میں گزرتے ہوں گے۔ یہی وہ وقت تھا جب مامون نے ایک اور منصوبے کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا اور حضرت امام علی رضاؑ کو، جو سادات و علویین کی عقیدت کا مرکز اور روحانی مرجع و امام تھے، ولی عہد بنانے کا ڈھونگ رچایا۔ اس نے بلا تاخیر "رجا ابن ابی ضحاک" کو مدینہ روانہ کیا تاکہ وہ جلد سے جلد آپ کو بصد عزت و احترام "مرو" لے آئے۔ جب آپ "مرو" تشریف لے آئے تو مامون نے دربار منعقد کیا اور حاضرین سے امام رضاؑ کے حق میں ولی عہدی کی بیعت لی۔ درباریوں کے لباس کا رنگ سیاہ کے بجائے سبز قرار دیا جو سادات کا امتیازی رنگ تھا پورے ملک میں بیعت عام لینے کا حکم جاری ہوا۔ شاہی اعلانِ عام یہ تھا کہ "امیر المومنین مامون کے بعد حضرت علی رضاؑ تاج و تخت کے مالک ہیں"۔ یہ حکم جب بغداد پہنچا تو ایک قیامت برپا ہوگئی عرب اور عباسیوں کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ عباسیوں نے مامون کی بیعت کا کلاوہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کی بیعت کر کے اُسے خلیفہ بنالیا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اگر مامون اپنے اس منصوبہ میں عباسیوں کو اعتماد میں لے لیتا تو یہ ہنگامہ برپا نہ ہوتا اور مامون اپنی سازش میں کامیاب رہتا مگر اس نے اپنی عادت کے مطابق اس منصوبے کے اثرات سے آلِ عباس کے چیدہ و برگزیدہ اشخاص کو آگاہ نہ کیا تھا۔ عباسی تو اس لئے مامون سے ناراض ہوئے کہ خلافت عباسیوں سے آلِ علیؑ میں کیوں منتقل کردی اور عرب اس لئے برگشتہ ہو گئے کہ اس نے فضل بن سہل کو سیاہ و سفید کے اختیارات کیوں دیدیئے؟ وہ عجمیوں کا خلافت پر تسلط برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مامون ماں کی طرف سے عجمی تھا۔ دربار اور فوج میں عجمیوں کی کثرت تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی ان حالات سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے وہ لکھتے ہیں "اس حالت میں اگر کسی سے ہمدردی کی توقع ہو سکتی تھی تو وہ صرف عباسی خاندان تھا لیکن مامون نے حضرت امام علی رضاؑ کو ولی عہد بنا کر

یہ بات بھی لکھ دی ہے۔" (المامون صفحہ ۱۵۱)

حالات کے اس مختصر تقابل اور تجزیہ سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس وقت مامون کے گرد ایسے حالات موجود تھے جن کے اثر و دباؤ سے وہ فضل بن سہل ذوالریاستین اور حضرت امامؑ کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے ذاتی اور خفیہ سازش پر مجبور ہوا، رہا یہ تاثر کہ مامون حضرت امام علی رضاؑ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا یا یہ حقیقت کہ وہ اہل بیت کا محب و بہی خواہ تھا تو اس کی کوئی اہمیت اس لئے نہیں رہ جاتی کہ تاریخ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جن میں حکومت کے لئے باپ کو بیٹے نے اور بھائی کو بھائی نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے اور مامون تو اسی مقصد کیلئے اپنے بھائی امین کے قتل کا مرتکب ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ ان حالات کو درست کرنے، عربوں اور عباسیوں کو مطیع بنانے اور اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے فضل بن سہل اور حضرت امام رضا علیہ السلام کو اس دنیا سے رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب امین نے مامون کے خلاف فوج کشی کی تھی تو مامون ہراساں، خوفزدہ اور ناامید تھا۔ اس وقت یہی فضل بن سہل تھا جس نے ڈھارس بندھائی اور مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ آہستہ آہستہ اس نے تمام علاقے قبضہ کر لئے اور امین بغداد میں محصور ہو گیا۔ ان مسلسل فتوحات کی خبریں جب مامون کو پہنچیں تو اس کی امیدیں وسیع ہو گئیں۔ اس نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا۔ درباریوں کو عہدے دیئے۔ فضل کو ان تمام مقبوضات کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے ساتھ ذوالریاستین کا لقب دیا اور تین لاکھ درہم ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اور جب فضل بن سہل ذوالریاستین نے امین کا سر ایک سپر پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا تو یہی مامون جسے رقیق القلب کہا جاتا ہے ایسا سنگدل ثابت ہوا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور خوشی کے جوش میں سجدہ شکر بجا لایا۔ قاصد کو دس لاکھ درہم انعام دیئے۔ یہی مامون جو خلافت حاصل کرنے کے لئے بھائی کے خون آلود سر کو دیکھ کر مسرت سے پاگل ہو جائے۔ اس خوشخبری کے سلسلہ میں قاصد کو دس لاکھ درہم بخش دے۔ یہی مامون جو فضل بن سہل ذوالریاستین جیسے محسن کو سازش سے قتل کرا دے۔ اس محسن کو جس نے اسے خلافت کے تخت پر بٹھایا صرف اس لئے کہ عرب اس سے خوش ہو جائیں تو پھر وہی مامون اپنے خاندان اور قبیلے کو خوش کرنے اور انہیں مطیع بنانے کے لئے حضرت امام رضاؑ کو کیوں شہید کرنے کی سازش نہیں کر سکتا جبکہ آپؑ

نے نہ تو اس پر کوئی احسان کیا اور نہ کوئی سلطنت دلوائی۔

مامون کے ایما پر فضل بن سہل کا قتل

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ مقتدر ہستیاں خواہ وہ حاکم ہوں یا عامل و خلیفہ جب کسی شخص کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتیں تو وہ قصاص اور بدنامی سے بچنے کے لئے اس کے خلاف حیلے بہانے تلاش کرتیں۔ بنو امیہ یہ عمل کسی بھی بہانے کھلم کھلا کر گزرتے اور کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے عیار و قاتل اجرت پر مستقل رکھے ہوئے تھے۔ یہ ان سے کام لیتے اور انہیں انعام و اکرام کے ساتھ تحفظ بھی فراہم کرتے۔ اس بارے میں خود مامون کا ایک قول تاریخ میں موجود ہے۔ اس کا ذکر علامہ شبلی نے بھی "المامون" کتاب میں کیا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "معاویہ کو عمر ابن عاص کی قوت حاصل تھی اور عبد الملک کو حجاج کی۔ لیکن مجھے خود اپنی" عمر بن عاص اور حجاج کے سبب معاویہ اور عبد الملک تاریخ میں بدنام بھی ہوئے اور ظالم بھی کہلائے، اس لئے بنی عباس کے خلیفوں نے ایک طریقہ اور ایجاد کیا تھا۔ وہ ایسے مستقل اجرتی لوگ نہیں رکھتے تھے بلکہ بر وقت کسی کا انتخاب کرتے انعام یا عہدہ کا لالچ دیتے یا وہ ایسا شخص ہوتا جسے قتل کئے جانے والے شخص سے دشمنی ہوتی یا کوئی خطرہ لاحق ہوتا اور جب وہ شخص قتل کا ارتکاب کر چکتا تو خلیفہ اسے قتل کے الزام میں قتل کرا دیتا اس طرح نہ تو خلیفہ پر کوئی حرف آتا "نہ بانس رہتا نہ بانسری بجتی" اس طرح اسے انصاف کی داد ملتی اور مقتول کے ورثا کی دعائیں اور ہمدردی۔ اس طریقہ کی ابتدا منصور عباسی نے کی تھی۔ اسے بعد میں سب نے اختیار کیا مامون بھی اسی طریقہ پر عمل کرتا تھا۔ چنانچہ مامون کا باپ ہارون کہا کرتا تھا "میں مامون میں منصور کا حزم، مہدی کی خدا پرستی اور ہادی کی شان و شوکت پاتا ہوں (المامون صفحہ ۱۹) منصور کے حزم سے مراد دراصل منصور کے وہی طور طریقے ہیں جو مامون نے اپنا لئے تھے اور کہا تھا "مجھے عمر بن عاص اور حجاج کی ضرورت نہیں میں خود اپنے لئے ہوں اسی لئے اس میں حزم یعنی استواری، ہوشیاری آگاہی، عاقبت اندیشی اور خرابی و ذلت سے بقدر امکان احتراز کرنا پایا جاتا تھا۔ اس نے فضل بن سہل کو قتل کرنے کا وہی طریقہ اپنایا جو منصور استعمال کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ بھی وہی برآمد ہوا جو منصور کے وقت برآمد ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم مامون کے اس طریقہ قتل کا تجزیہ کریں منصور کا واقعہ باوجود

خوفِ طوالت، بیان کرنا پسند کرینگے تاکہ یقین ہو جائے کہ مامون سے یہ فعل کوئی بعید نہیں ہے"۔

"ابن جریر اور دوسرے مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ منصور نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو گرفتار کیا اور رات کی تاریکی میں خفیہ طور پر اسے عیسٰی بن موسیٰ کے حوالہ کیا اور اس سے کہا: اُس نے مجھے خلافت سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح یہ تم سے بھی خلافت کو الگ کر دینا چاہتا تھا کیونکہ تم مہدی کے بعد میرے ولی عہد ہو اسے اس طرح نے جاؤ کہ کوئی نہ دیکھے۔ اور موقع پاکر اس کی گردن مار دینا اور خبردار کمزوری یا بزدلی نہ دکھانا۔ اسی دوران عیسٰی بن موسیٰ کے مخبر نے اسے خبر دی کہ منصور آپ کو اور عبداللہ، دونوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ عیسٰی نے پوچھا وہ کس طرح؟ مخبر نے جواب دیا، وہ اس طرح کہ اس نے تم کو اس کے قتل کا حکم تو خفیہ دیا ہے اور تم پر خون کا دعویٰ کھلم کھلا ہوگا اور تمہارے قتل کا حکم علی الاعلان کریگا اور خود بری الذمہ ٹھہرے گا۔ یہ بات عیسٰی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے پوچھا، پھر تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ مخبر نے رائے دی، فی الحال عبداللہ کو اپنے مکان میں پوشیدہ رکھو جب منصور تم سے علانیہ طلب کرے تو تم بھی علانیہ اس کو پیش کر دینا۔

چند روز بعد ہی منصور نے عیسٰی کو رقعہ بھیجا اور اس سے پوچھا "جس چیز کا میں نے تم کو حکم دیا تھا تم نے وہ حکم نافذ کیا یا ابھی نہیں؟" عیسٰی نے جواباً کہلایا کہ "آپ نے جو حکم دیا تھا اس کا نفاذ ہو چکا۔" منصور مطمئن ہو گیا اور اس نے یقین کر لیا کہ عبداللہ بن علی کو قتل کیا جا چکا ہے تو اس نے دوسری ترکیب پر عمل کیا اور ایک شخص کو خفیہ طور پر سمجھایا کہ وہ عبداللہ کے چچا کی اولاد کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ عبداللہ کو رہا کر کے ان کے سپرد کرنے کا مطالبہ پیش کریں، اور اگر وہ ایسا کرینگے تو عبداللہ کو یقیناً رہا کر کے ان کے سپرد کر دیا جائیگا چنانچہ عبداللہ کے چچازاد بھائیوں نے منصور سے عبداللہ کی واپسی اور رہائی کا مطالبہ کیا۔ وہ اسی وقت کا منتظر تھا۔ اس نے اسی وقت سب کی موجودگی میں عیسٰی بن موسیٰ کو بلوایا اور حاضرین کے سامنے اس سے کہا "اے عیسٰی! میں نے عبداللہ بن علی کو تمہارے سپرد کیا تھا۔ اب یہ لوگ اس کی رہائی کے بارے میں گفتگو کرنے آئے ہیں۔ تم فوراً عبداللہ کو یہاں حاضر کرو" عیسٰی سب کچھ سمجھ گیا مگر بہت پریشان ہوا۔ وہ صرف اسی قدر کہہ سکا کہ "اے امیر المومنین آپ نے تو اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا"۔ منصور بگڑ گیا اور غضبناک ہو کر کہا تو جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا اور بغیر توقف ان لوگوں سے کہا "تم نے خود سن لیا یہ عبداللہ کے قتل

کا اقرار کر چکا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے حکم دیا تھا، یہ جھوٹ بولتا ہے" عبداللہ کے چچا کی اولاد نے فوراً ایک دُوسرا مطالبہ منصُور کے سامنے رکھدیا کہ پھر تو آپ اس کو ہمارے سپرد کر دیجئے تاکہ ہم قصاً میں اسے بھی وہیں پہنچا دیں جہاں عبداللہ ہے" منصور نے فوراً کہا "تمہیں اختیار ہے اور عیسیٰ کو اُن کے حوالے کر دیا"

یہ لوگ عیسیٰ کو لیکر ایک میدان میں آ گئے، تاکہ قتل کر دیں۔ لوگ جمع ہو گئے۔ عبداللہ کے عزیزوں میں سے ایک شخص نے تلوار نکالی اور چاہتا تھا کہ عیسیٰ کا سرتن سے جُدا کر دے، عیسیٰ نے اس سے پوچھا کیا واقعی تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اُس نے کہا ہاں واللہ، عیسیٰ نے اس سے کہا لیکن عبداللہ زندہ ہے۔ جب لوگوں نے یہ سُنا تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ عیسیٰ نے ان سے کہا یہ ایک راز ہے اور اگر تم اس راز سے واقف ہونا اور عبداللہ کو زندہ و سلامت لینا چاہتے ہو تو مجھے واپس منصور کے پاس لے چلو۔ وہ لوگ عیسیٰ کو منصور کے پاس لے آئے۔ عیسیٰ نے منصور سے مخاطب ہو کر کہا" آپ نے عبداللہ کو قتل کر کے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا تاکہ ہم دونوں آپ کی راہ سے ہٹ جائیں اور آپ پر کوئی الزام نہ آئے۔ لیکن میں نے اس فریب کو سمجھ لینے کے بعد عبداللہ کو محفوظ رکھا تھا اور یہ ہے آپ کا وہ رقعہ جس میں آپ نے اس حکم پر عمل کے متعلق دریافت کیا تھا۔ آپ کا چچا زندہ و سلامت میرے پاس موجود ہے اور پھر عبداللہ بن علی کو بلوا کر سامنے کھڑا کر دیا" (کتاب الاذکیاء، ابن جوزی، بغدادی)

بالکل یہی طریقہ مامون نے خود کو بچانے اور فضل بن سہل کو قتل کرنے میں اختیار کیا تھا۔ ہارون کا قول موجود ہے کہ مامون میں منصور کا حزم پایا جاتا ہے۔ منصور کے اسی حزم و احتیاط سے اُس نے کام لیا تھا لیکن خود مامون کا قول بھی موجود ہے کہ "میں کسی عمرو بن عاص اور حجاج پر نہیں خود اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہوں" لہٰذا اسی حزم و احتیاط سے وہ منصور کی طرح شرمندہ نہیں ہوا، اور اُس نے بلا تاخیر فضل کے قاتلوں کو قتل کر کے اس راز کو منکشف نہیں ہونے دیا۔ اجرتی قاتلوں کے الزام کے جواب میں مامون نے وہی کہا تھا جو منصور نے کہا تھا یعنی یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور اُس کے بعد قاتلوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ انہیں قتل کر دیا گیا۔ لوگ شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ قاتل خود کو بچانے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اُس وقت مامون بغداد سے دُور محوِ سفر تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ قاتل

سفر کے دوران مامون ہی کے بھیجے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ مامون کے یہ الفاظ بھی تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ جن کا ذکر علامہ شبلی نے کیا ہے۔ یعنی جب فضل نے مجرموں کو سزائیں دیں اور مامون اس سے باز پرس نہ کر سکا تو حضرت امام علی رضاؑ نے مامون کی توجہ اس طرف دلائی۔ مامون کا جواب یہ تھا۔ "میں غافل نہیں ہوں مگر تدبیر مناسب سے کام لینا چاہتا ہوں۔" (المامون صہ ۸۱) اور وہ "تدبیر مناسب" یہی تھی کہ اس نے خاموشی سے چار شخص اس کے قتل پر متعین کئے جنہوں نے اس وقت جب مامون سرخس میں مقیم تھا۔ فضل کو حمام میں گھس کر قتل کر ڈالا۔

جھوٹ بولنے والے کے جھوٹ کے خلاف کوئی گواہ نہیں ہوتا سوائے اس کے ضمیر کے۔ اور اس کا ضمیر خود اس کے خلاف گواہی دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس طرح سچ پر شکوک و شبہات غالب آجاتے ہیں۔ مامون نے قاتلوں کو قتل کرا کے اپنے خلاف گواہی کی راہیں مسدود کر دیں۔ سچائی شک و شبہ کا شکار ہو گئی۔ بعد میں لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مامون کو بری الذمہ قرار دینے کی راہ نکال لی یا کم سے کم مورخ نے یقینی طور پر مامون کو ملزم قرار دینے سے احتراز کی راہ ضرور نکال لی۔ اس کی مثال علامہ شبلی کے الفاظ سے مل جاتی ہے۔ وہ اس موقع پر لکھتے ہیں۔ "جب یہ (قاتل) لوگ مامون کے سامنے حاضر کئے گئے اور پوچھا گیا کہ کس کے ایما سے تم نے ایسا کیا؟ تو سب نے خود مامون کا نام لیا، اور اس بیباکی پر یا اصل جرم کی پاداش میں مامون کے حکم سے قتل کر دیئے گئے۔" (المامون صہ ۸۱) یہاں علامہ نے قتل کے حکم کے دو سبب بتلائے ہیں ایک یہ کہ انہوں نے بیباکانہ مامون پر قتل کے حکم کا الزام لگایا دوسرے یہ کہ انہوں نے قتل کیا تھا۔ ہمارے خیال میں وہ یہ کہنا نہیں چاہتے کہ مامون نے انہیں اس لئے قتل کر دیا تاکہ سازش کا راز فاش نہ ہو جائے۔

اکثر مورخ واقعاتی شہادت کی بنیاد پر مامون ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ علامہ شبلی نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ذوالریاستین کا قتل مامون کے ایماء سے ہوا تھا۔ مگر مامون نے اپنی متعدد کارروائیوں سے اس یقین کو شبہ سے بدل دیا۔ قاتلوں کے سر فضل کے بھائی حسن بن سہل کے پاس بھجوائے۔ تعزیت نامہ میں رنج و غم کا اظہار کیا۔ اسے فضل کی جگہ منصب وزارت پر فائز کیا۔ اس کی ماں سے تعزیت خود جا کر کی اور فضل کی جگہ خود کو مطیع فرزند ظاہر کیا۔ اور پھر حسن بن سہل کی بیٹی سے شادی کر کے مامون نے اسے ایک اور اعزاز بخشا۔ یوں مامون نے شکوک و شبہات کو بھی اپنی ذات سے

دُور کر دیا۔

مامون کے ایما پر حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت

گزشتہ صفحات میں کیئے گئے تجزیہ کی بنیاد پر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام علی رضاؑ علیہ السّلام کو بھی مامون ہی کے ایما پر زہر دے کر شہید کیا گیا۔ اگر مامون خلافت حاصل کرنے کے لئے اپنے اس بھائی کو قتل کرا سکتا ہے جس کی وہ بیعت کر چکا تھا۔ اگر مامون ابتدائی فتح کی خوشی میں القابات و انعامات دے سکتا ہے۔ اگر بھائی کا خون آلود سر دیکھ کر مسرت کا اظہار کر سکتا ہے اور اس ایک خبر پر قاصد کو فی الفور دس لاکھ درہم ادا کر کے سجدۂ شکر بجا لا سکتا ہے۔ اگر وہ فضل بن سہل جیسے شخص کو جس نے اسے امیر المومنین بنایا تھا، سازش سے قتل کرا سکتا ہے تو وہ کون سی وجہ ہے جس کی بناء پر وہ حضرت امام علی رضاؑ کو زہر دلا کر شہید نہیں کرا سکتا اور کون سے وہ ایسے اسباب ہیں جن کے ہوتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مامون نے ایسا نہیں کیا ہوگا امام سے عقیدت و احترام اور سادات سے اچھا سلوک اس کی بنیاد ہرگز نہیں بنتے کیونکہ امام کی شہادت سے قبل اس کا بہتر سلوک تو اس فرض کی ادائیگی تھی جو اس نے اپنے اوپر واجب کر لی تھی اور اس کا اقرار اس نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔ اس نے ایک بار کہا۔

> "ابو بکرؓ نے اپنے زمانِ خلافت میں ایک بنی ہاشم کو بھی کوئی ملکی عہدہ نہیں دیا۔ عمرؓ و عثمانؓ نے بھی اس خاندان کے ساتھ کچھ فیاضی نہیں کی لیکن علی مرتضیٰ خلیفہ ہوئے تو عبداللہ بن عباس کو بصرہ، عبیداللہ کو یمن، معبد کو مکہ، قثم کو بحرین کی حکومت دی۔ اور آلِ عباس میں کوئی باقی نہیں رہا جس کو حکومت میں کوئی حصہ نہ ملا ہو، ہمارے خاندان پر یہ قرض باقی چلا آتا تھا جس کو اب میں نے ادا کیا ہے۔

(تاریخ الخلفاء سیوطی) (المامون ص ۲۱۵ شبلی نعمانی)

مامون کا تمام صحابہ پر حضرت علیؑ کی فضیلت کا اعتراف اور اس پر استحکام ایک بین حقیقت کا قبول کرنا ہے۔ اس میں اس کی علمیت کو بھی دخل تھا۔ آل علی سے محبت اور حسن سلوک حضرت علیؑ کے ان احسانات کی وجہ سے تھا جو آپؑ نے مامون کے اسلاف پر کئے تھے جن کا اعتراف اس نے خود کیا ہے۔ لیکن اگر ان مسلمہ احسانات کے ہوتے ہوئے مامون کے اجداد آل علیؑ سے بے وفائی کر کے خلافت پر قابض ہو سکتے ہیں تو مامون بھی نظریں پھیر کر، خلافت بچانے کیلئے حضرت امامؑ کو شہید کرا سکتا ہے۔ مامون نے جو نوازشات آل علی اور سادات پر حضرت امام کی شہادت کے بعد فرمائیں ان کی حیثیت بالکل وہی ہے جو مورخین نے فضل بن سہل کے قتل کے بعد اس کے خاندان پر کی گئی عنایات کے متعلق بیان کی ہے۔ اور یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ فضل کو مامون ہی نے قتل کرایا تھا۔ چنانچہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔ "تمام واقعات شہادت دے رہے تھے کہ ذوالریاستین کا قتل مامون کے ایما سے ہوا ہے مگر مامون نے اپنی متعدد کارروائیوں سے اس یقین کو شبہ سے بدل دیا (یہ کارروائیاں فضل کے خاندان پر عنایات تھیں) آگے لکھتے ہیں۔ "ان کارروائیوں سے گو مامون کی گردن ذوالریاستین کے خون سے ہلکی نہ ہوئی تاہم عام خلقت کی نگاہ بہت کچھ بدل گئی (المامون ۸۲-۸۱) نگاہ خلقت میں تبدیلی بھی اس حالت میں آئی جبکہ قاتل مامون کا نام لے چکے تھے اور بقول علامہ شبلی واقعات ثابت کر رہے تھے کہ قتل مامون کے ایما سے ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں حضرت امامؑ کی شہادت کے موقع پر خلقت کی نگاہیں کیوں نہ بدل جائیں گی جبکہ نہ تو کسی نے مامون کا نام لیا اور نہ مجرم گرفتار ہوئے یہی وجہ ہے کہ سنی مورخین اور مامون کے طرفداروں کو اسے بچانے اور خلقت کی نگاہ کو بدلنے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ علامہ شبلی نے بھی بڑے طمطراق سے لکھا کہ "جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایک مورخ نے بھی مامون پر یہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کی۔ لیکن اسی موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کا موقف مختلف ہے وہ مامون ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

فضل بن سہل نے مامون کو تخت خلافت دلا کر اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ مامون نے اس صلہ میں اسے وسیع اختیارات کا مالک بنا دیا۔ اگر اس سے عرب ناراض ہو گئے تو یہ مامون کی غلطی کہی جائے گی اسے خود اس کا خیال رکھنا چاہیئے تھا۔ پھر بھی فضل ان عربوں کی [illegible] میں مصروف تھا اس کی کوشش تھی کہ مامون تک ان [illegible] کے پہنچنے سے پہلے وہ حالات [illegible]

پالے اسی وجہ سے اس نے مخبروں کی حرکات و سکنات پر پابندی لگادی تھی اور ان کے منہ بند کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے فوراً بعد حضرت امام رضا علیہ السّلام کی ولی عہدی کا اعلان عام ہُوا تو بغداد میں مزید ابتری پھیل گئی اور عربوں کے ساتھ عباسی بھی مامون کے خلاف ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے ابراہیم بن مہدی کو اپنا خلیفہ بنا لیا اور حالات فضل کے قابو سے باہر ہو گئے۔ جب یہ خبر مامون کو "مرو" میں ملی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بغیر کسی باز پرس کے فضل کو ذمہ دار ٹھہرایا جب فضل نے مخبروں کو اذیت ناک سزائیں دیں تب بھی مامون نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ یہ حالت یکطرفہ شدید ردِ عمل اور یک طرفہ فیصلہ کُن ارادہ کی عکاسی ہے چنانچہ جب حضرت امام نے مامون کی توجہ فضل کے اس ظلم و ستم کی طرف دلائی تو اس کا جواب خود اس کے یکطرفہ فیصلہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا "میں غافل نہیں ہوں مگر مناسب تدبیر کی فکر میں ہوں" اور یہ مناسب تدبیر اُس کے قتل کی خفیہ سازش تھی۔

مامون کی نظر میں فضل کا گناہ یہ تھا کہ اُس نے یہ اطلاعات مامون تک پہنچنے سے روک دی تھیں۔ اگر مامون فیصلے سے پہلے صرف باز پرس کے طور پر ہی تحقیقات کر لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ فضل کا یہ عمل اتنا بڑا گناہ نہیں تھا جس کی سزا قتل ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے طور پر عربوں کو راضی کرنے کے لئے یہ فیصلہ کر چکا تھا اور اسے قتل کرنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ اسی لئے اسے باز پرس یا تحقیق کرنے کی کوئی حاجت نہ رہی تھی۔

اب اگر مامون اپنا تخت بچانے اور عربوں کو خوش کرنے کیلئے فضل جیسے "مدبر محسن" کو قتل کر سکتا ہے تو وہ اپنی خلافت برقرار رکھنے اور اپنے قبیلے کے افراد بنو عباس کو خوش کرنے کیلئے امام علی رضاؑ کو شہید کرنے سے کیونکر باز آسکتا ہے۔ جبکہ بنو عباس نے، مامون کو معزول اور ابراہیم کو اپنا خلیفہ منتخب بھی کر لیا تھا۔ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ دونوں خبریں ایک ساتھ پہنچی تھیں یعنی فضل کی وجہ سے عربوں کی ناراضگی کی خبر اور امام کی ولی عہدی کے سبب بنو عباس کی مخالفت کی اطلاع لہٰذا اُس نے دونوں کے متعلق ایک ساتھ فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس کے اس قول میں "کہ میں غافل نہیں ہوں مگر مناسب تدبیر کی فکر میں ہوں" حضرت امام کے متعلق فیصلہ کا بھی اشارہ موجود ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائیگا کہ فضل اور امام سے متعلق معاملات کے اثرات یکساں تھے عربوں اور بنو عباس کی ناراضگی

کی نوعیت میں بھی کوئی فرق نہ تھا، پھر اس کے تدارک کے طریقوں میں کیونکر فرق ہو سکتا ہے؟

علامہ شبلی لکھتے ہیں: "مامون نے بے شبہ ذوالریاستین کو خلافت کی نذر کر دیا۔ اب اگر یہ الزام کی بات ہے تو ہو ہم مامون کو اس سے نہیں بچا سکتے" (المامون ص ۱۵۲)۔ اب اگر ہم بھی یہی کہیں کہ "مامون نے بے شبہ امام علی رضا کو خلافت کی نذر کر دیا" اور اب یہ الزام کی بات ہے تو ہم مامون کو اس سے نہیں بچا سکتے، تو کیا یہ غلط کہیں گے؟

اب رہی یہ بات کہ مامون شیعہ تھا جیسا کہ اہل سنت مورخ، بقول شبلی، اس کے محاسن و فضائل کا اعلانیہ اعتراف کر کے بڑی حسرت سے لکھتے ہیں کہ "افسوس شیعی تھا"۔ حالانکہ شیعہ اس کے تشیع کو فریب قرار دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ اس لئے کہ بنو عباس نے سفاح کے خلافت پر قبضہ کرنے کے بعد مذہبی اور عقائدی نظریات میں واضح تبدیلی کر لی تھی۔ وہ عین وقت پر مصلحت کے مطابق عقائد میں تبدیلی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ہر خلیفۂ عباسی کا مذہبی عقیدہ اس کے اپنے زمانہ اور مصلحت کے مطابق تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت تک پہنچنے سے قبل تمام بنو عباس شیعہ تھے۔ وہ خلافت، اہلبیت کا حق سمجھتے تھے۔ شیخین کی خلافت کو مغصوبہ و مقبوضہ خلافت قرار دیتے تھے۔ تمام صحابہ پر حضرت علیؑ کو افضل گردانتے تھے اور یہی سبب تھا کہ اہلبیت کی طرح عباسیوں کو بھی خلافت میں کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔ صرف حضرت علیؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کا حق ادا کیا۔ تمام بنی عباس سادات و علویین کے شانہ بشانہ، بنی امیہ سے جنگ کرتے رہے وہ آلِ علیؑ کو ان کا حق دلانا چاہتے تھے لیکن ابو مسلم خراسانی کی تحریک کامیاب ہو گئی اور علوی کی جگہ عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح عباسی خلیفہ ہو گیا تو اس خلافت کے جاری رکھنے اور استحکام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اُس وقت سیاسی گروہ بالمقابل تھے ایک بنی امیہ اور ان کے بہی خواہ، یہ خروج انہی کے خلاف تھا اموی شاہی خاندان کا صرف ایک وارث عبدالرحمٰن جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ باقی تمام قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے بنی امیہ عباسی خلافت کے خلاف تھے۔ دوسرے اہل سنت، وہ عباسیوں سے شیعہ ہونے کے سبب مخالف تھے۔ تیسرے علوی، یہ خلافت پر قبضہ جما لینے کے سبب عباسیوں سے ناراض تھے اور ان کی خلافت کے شدید مخالف وہ اپنے حق کا بدستور مطالبہ کر رہے تھے۔ عباسیوں کے لئے یہ سخت دشواری درپیش تھی کہ ایک گروہ بھی ان کا موافق نہ تھا۔ ان کی خلافت کو تسلیم

کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اب وہ حکومت کریں تو کس پر؟ اور حکم کریں تو کس کے ذریعہ اور کس کی مدد سے یعنی حکومت کے عہدے کس کے سپرد کریں؟ اس وقت عباسیوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی جیسا کہ مامون کے زمانہ میں یعنی صرف نویں پشت میں تینتیس ہزار تک ان کی تعداد پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ پرآشوب دور اور بے کسی و بے یاری کا یہی وہ زمانہ تھا جب بنو عباس نے اپنے عقائد میں تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ چونکہ خلافت بنو امیہ سے چھینی گئی تھی لہٰذا ان سے معاونت ممکن ہی نہ تھی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو پھر بنو امیہ کے خلافت پر قابض ہونے کا خطرہ تھا۔ علویوں سے معاونت اس لئے ممکن نہ تھی کہ وہ خود خلافت کے دعویدار تھے۔ عباسیوں نے خود انہیں دھوکہ دیا تھا وہ کبھی پوری خلافت لئے بغیر ان سے تعاون نہ کرتے۔ اور وہ وہی مطالبہ کرتے جو بنی عباس کے جد اعلیٰ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے ابوبکرؓ و عمرؓ سے کیا تھا۔ ان حضرات نے مغیرہ کے مشورہ پر حضرت عباس سے کہا تھا کہ آپ رسول اللہ کے چچا ہیں ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصّہ ہو جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے لیکن حضرت عباس عم رسول اللہ نے یہ پیشکش رد کر دی تھی کہ " اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابوبکر ص حسنین ہیکل مصری)

آل علی بھی محض اس پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے کہ خلافت میں انہیں شریک کر لیا جائے اور بس۔ لے دے کے ایک گروہ اہل سنّت کا باقی رہتا تھا جن سے عباسی معاونت کر سکتے تھے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنے عقائد میں تبدیلی کی، انہوں نے صحابہ میں شیخین کی برتری تسلیم کر لی۔ ان کی خلافت کو بھی جائز قرار دیدیا اور یوں وہ خلافت پر قبضہ باقی رکھنے کیلئے سنی ہو گئے۔ اس خیال کا اظہار بیشتر تاریخی محققین نے کیا ہے اور تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے کہ عباسی خلفاء وقت اور مصلحت کے تقاضوں کے ساتھ اپنے مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرتے رہے ہیں۔ ان میں کوئی اعلانیہ سنی ہوتا اور کوئی شیعہ اور کوئی بین بین ان دونوں عقیدوں کا آمیزہ و آمیختہ خود کو ظاہر کرتا۔ کوئی اہلبیت سے محبت و رواداری کا اظہار کرتا اور کوئی عداوت کا۔ کوئی ائمہ کو پابند رکھتا اور کوئی ان پابندیوں سے آزاد کر دیتا غرض بنی عباس کے خلیفہ، اپنی خلافت کو محفوظ و مصئون رکھنے کیلئے وقت کے تقاضوں اور مصلحت کی بنیاد پر اپنے عقائد میں تبدیلی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان ہی میں خلیفہ مامون ہے جس نے حالات کا رخ دیکھ کر ابتدا میں خود کو

علانیہ شیعہ ظاہر کیا۔ اہلبیت سے محبت کا دعویدار بنا۔ مگر جب علویوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو اس نے حضرت امام رضاؑ کو مدینہ سے بصد احترام "مرو" بلوایا اور آپ کے ولی عہد خلافت ہونے کا اعلان عام کر دیا، اس سے پہلے کہ اس اعلان کا علویوں پر کوئی مثبت اثر ہوتا بغداد میں عباسیوں نے مامون کی بیعت توڑ دی اور ابراہیم کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا، صرف یہی نہیں ابراہیم نے مدائن پر قبضہ کر لیا اور حسن بن سہل سے جنگ شروع کر دی۔ گویا مامون کا یہ منصوبہ اپنے آغاز ہی میں نہ صرف ناکام بلکہ معکوس صورت اختیار کر گیا امن کے بجائے فساد و بغاوت سے واسطہ پڑا اور خلافت کے استحکام کی جگہ معزولی حصہ میں آئی۔ کون سا سیاسی، صاحب عقل و فہم مبصر ہے جو اس موقع پر یہ نتیجہ نہیں نکالے گا کہ بنو عباس جو وقت کے ساتھ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے عادی تھے ان ہی میں کے ایک ہوشیار فرد مامون نے فضل اور امام رضاؑ دونوں سے بیک وقت نجات حاصل کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہوگا۔ اس نے پہلے فضل کو تلوار سے قتل کرایا پھر حضرت امامؑ کو زہر سے شہید کرایا۔

شہادت امام رضاؑ کے بعد مامون کی علویوں اور سادات پر عنایات کی حیثیت ہم لکھ چکے ہیں کہ وہی ہے جو فضل کے قتل کے بعد اس کے خاندان کے افراد پر کی گئی مہربانیوں کی حیثیت محققین نے متعین کی ہے۔

مامون کے بغداد پہنچنے میں تاخیر کا راز؟

مامون نے بیعت خلافت کے بعد اپنا دارالخلافہ "مرو" کو قرار دیا تھا۔ جہاں وہ دنیا و مافیہا سے بے فکر زندگی گزار رہا تھا۔ ادھر عراق خصوصاً بغداد میں قیامت صغریٰ برپا تھی۔ فضل جو با اختیار کلی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز تھا بغاوتوں سے نمٹنے کی کوشش میں مصروف تھا اس نے یہ خبریں مامون تک پہنچنے سے روک دی تھیں۔ یہ خبریں مامون تک پہنچیں مگر اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ایک ہی وقت میں عربوں اور عباسیوں کی بغاوت کی خبر، اس پر مستزاد ابراہیم کے خلیفہ اور اپنی معزولی کی اطلاع نے اس کے ہوش و حواس مختل کر دیئے۔ مخبروں نے مامون کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اگر فی الفور بغداد پہنچ جائے تو بغاوت پر قابو پایا جا سکتا ہے اور یہ حقیقت تھی کہ بعض لوگ یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ ابراہیم کی خلافت اسی وقت تک ہے جب تک

مامون بغداد نہیں پہنچا اور ہوا بھی یہی کہ جب مامون کے بغداد کی جانب روانگی کی اطلاع پہنچی تو اکثر ابراہیم کا ساتھ دینے والے ایک ایک کر کے مختلف حیلے اور بہانوں سے ابراہیم سے جدا ہونے لگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مامون بغداد بہت تاخیر یعنی کوئی ایک سال سات ماہ کے بعد پہنچا آخر اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اس تاخیر میں مامون کی جو سیاسی مصلحتیں اور جو سیاسی مفاد پوشیدہ تھے ان کی جانب محققین نے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ علامہ شبلی اسے ملکی دورہ سے تعبیر کر کے قارئین کی توجہ سیاسی مصالح سے ہٹانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے نازک اور پُر خطر حالات میں جبکہ بغداد پہنچنے ہی میں عافیت نظر آرہی ہو اور مشیر بھی یہی مشورہ دے چکے ہوں۔ مامون کا ملک کے دورہ پر نکل پڑنا سیاسی عقل و دانش کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ اس دورے سے متعلق جن مقامات کا تاریخ میں ذکر ملتا ہے وہ ایران کے پر امن علاقے ہیں ان حالات میں تو ملک کے اس حصہ کا دورہ کرنا چاہیے جو بغاوت کی لپیٹ میں ہو۔ اور یہ عراق کا عرب علاقہ تھا۔ یہ یقین کر لینے کے باوجود کہ بغاوت کے خاتمہ کا انحصار محض اس بات پر ہے کہ مامون جس قدر جلد ہو سکے خود کو بغداد پہنچا دے پھر بھی اس کا خراسان سے ایک سال اور سات ماہ کی مدت میں بغداد پہنچنا اور اثنائے سفر چھوٹی، چھوٹی بستیوں میں طویل قیام کرنا، پھر اس سفر کو ملکی دورہ کا نام دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ مامون کا یہ عمل کسی سیاسی علت کے بغیر نہیں تھا اور یہ صورت حال کسی سوچے سمجھے منصوبے سے خالی ہرگز نہیں تھی۔ مورخین نے نہ جانے کیوں اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی مبصرین نے اس پر کوئی اظہار خیال کیا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ مامون کی عمداً یہ تاخیر محض اس سبب سے تھی کہ وہ فضل بن سہل اور حضرت رضا کے قتل کے منصوبہ کو بغداد پہنچنے سے قبل پایہ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا تاکہ عربوں اور عباسیوں دونوں کے آگے سرخروئی حاصل کر سکے اور ان سے کہہ سکے کہ دیکھ لو میرا دامن ان الزامات سے پاک ہے جو تم ان دونوں سے متعلق مجھ پر عائد کرتے ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ بغداد میں داخل ہو تو عرب اور عباسی کھلے دل سے اس کا پر تپاک خیر مقدم کریں اور اُسے ان دونوں کے سامنے اپنے حق میں صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہ آئے اور لوگ خود بخود جان لیں کہ پوری اسلامی دنیا میں مامون ہی کی عملداری ہے چنانچہ جب مامون نے بغداد کی حدود میں قدم ؁۲۰۴ھ وقت نہ تو فضل بن سہل وزارت پر قائم تھا اور نہ ہی حضرت امام رضا اس کے ساتھ موجود تھے۔ اور اس وقت جس

تزک و احتشام سے مامون کا استقبال ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس موقع پر مامون نے جو عملی اعلان کیا وہ یہی تھا کہ "اب اسلامی دنیا میں آلِ عباس کی حکومت ہے۔"

اس موقع پر علامہ شبلی لکھتے ہیں: "نہروان میں آٹھ دن قیام کرکے، مامون بغداد کو چلا۔ اور ۱۵ صفر ۲۰۴ھ کو بڑی شان و شوکت سے دارالخلافہ (بغداد) میں داخل ہوا۔ جہاں ایک مدت سے ہزاروں نگاہیں اس کا انتظار کر رہی تھیں ــــ اس نے خود دربارِ عام میں سیاہ لباس جنگ کر پہنا اور تمام افسرانِ فوج کو سیاہ رنگ کے خلعت مرحمت کئے۔ ۲۳ صفر ۲۰۴ھ کو کل اہلِ بغداد سیاہ لباس میں تھے اور اس دن گویا یہ عملی اعلانِ عام نے دیا کہ اب تمام اسلامی دنیا میں آلِ عباس کی حکومت ہے۔" (المامون)

بغداد میں داخلے سے قبل اور امام علی رضا کی شہادت کے فوراً بعد مامون نے اہلِ بغداد جن میں عرب و عباسی شامل تھے ایک خط لکھا جس کا ذکر طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور علامہ شبلی نے کیا ہے اس موقع پر علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں: "چونکہ ذوالریاستین (فضل بن سہل) اور حضرت علی رضاؑ کی وفات نے اہلِ بغداد کی کل شکایتوں کا فیصلہ کر دیا، مامون نے بغداد کے لوگوں کو ایک خط لکھا کہ اب کیا چیز ہے جس کی تم شکایت کر سکتے ہو۔ مگر مامون کو خلافِ توقع اپنی تحریر کا سخت جواب ملا (المامون صفحہ)

لیکن یہی مامون جب بغداد میں داخل ہوا تو عرب و عباسی تمام اہلِ بغداد اپنی آنکھیں فرشِ راہ کئے مامون کے منتظر تھے۔

اب کون سا صاحب فکر و فہم مورخ اور کون سا اہلِ فکر و نظر مبصر ہوگا جو ان حقائق کے ہوتے ہوئے یہ رائے قائم نہیں کرے گا کہ مامون کے اس نام نہاد ملکی دورہ کا مقصود اور اس سفر میں تاخیر کا سبب اس کے علاوہ کچھ اور تھا کہ وہ بغداد میں داخلہ سے پہلے عرب اور آلِ عباس کو خوش اور مطمئن کرنے کا سامان مہیا کرے اور ایسا نہ ہو کہ اسے اپنی قوم اور اپنے قبیلے کے بزرگوں کے سامنے شرمسار ہونا پڑے۔

ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ حضرت امام علیہ السلام کے توجہ دلانے پر جب مامون نے یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ "میں غافل نہیں ہوں مگر مناسب تدبیر کی فکر میں ہوں" تو گویا وہ غیر واضح اور غیر ارادی طور پر یہ کہہ رہا تھا کہ میں دونوں ہستیوں سے چھٹکارہ کی تدبیر پر مناسب وقت کا

منتظر ہوں" اور ایسا ہی ہوا۔ چند ہی روز بعد اس کی مناسب تدبیر کا ایک حصہ فضل بن سہل کے قتل سے ابتدائے سفر میں مکمل ہو گیا۔ اور اسی سفر کے اختتام پر اس کی مناسب تدبیر کا دوسرا حصہ اپنی تکمیل کو امام رضاؑ کی شہادت کے ساتھ پہنچ گیا اور جب تک یہ منصوبہ اپنے انجام کو نہ پہنچا وہ بغداد میں داخل نہ ہوا۔

اس سفر کو "ملکی دورہ" کا نام اس لئے بھی نہیں دیا جا سکتا کہ مامون کا اچانک "مرو" سے بغداد جانے کا ارادہ اور اس سفر کی تیاری بلا تاخیر بغداد پہنچنے کے ارادہ اور عزم کے ساتھ کی گئی تھی نہ کہ ملکی دورہ کے طور پر۔ پھر اثنائے سفر میں جن مقامات پر ٹھہرنے کا ذکر کیا جاتا ہے مثلاً سرخس، ہمدان، جرجان، نہروان اور رے وغیرہ یہ وہ مقامات ہیں جو "مرو" اور بغداد کے درمیان ہر مسافر کی راہ میں آتے تھے اور حسب ضرورت یہاں قیام بھی کیا جاتا تھا۔ اہم ضرورتِ حال کے تحت چاہیئے تو یہ تھا کہ مامون بغیر قیام کئے سفر جاری رکھتا اور بلا تاخیر بغداد پہنچتا فضل بن سہل سے باز پرس کرتا، لوگوں کی شکایتیں سنتا ان کا فی الفور ازالہ کرتا، عربوں اور عباسیوں کی غلط فہمی دور کرتا یا جو کچھ بھی اس وقت کی مصلحتیں تھیں ان کے مطابق حالات کو سدھارتا لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ وہ "مرو" سے چل کر راہ میں آنے والی پہلی ہی آبادی "سرخس" میں قیام پذیر ہو گیا، ابھی تو آغاز ہی تھا، سفر کی کلفتوں سے واسطہ بھی نہ پڑا تھا کسی قسم کی کسل، جسمانی تھکن کا شائبہ بھی نہ تھا کوئی سفری۔ بیماری بھی نہ تھی اس کے باوجود اس نے "سرخس" کے قیام کو طول دیا۔ حصولِ معلومات اور انتظامی امور کی درستی کو بہانہ بنایا اور یہی وہ نکتہ ہے جس سے مورخین نے اس سفر کو ملکی دورہ سے تعبیر کیا ہے۔ بہرحال مامون "سرخس" میں مقیم تھا کہ فضل بن سہل کے قتل کی اطلاع اسے یہیں ملی۔ شاید وہ اپنی "مناسب تدبیر" کے نتیجے کی اسی اطلاع کا منتظر سرخس میں مقیم تھا۔

اس صورت حال سے یہ بات واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس نے خراسان ہی سے اپنے آدمی، فضل کے قتل کا حکم دے کر روانہ کر دیئے تھے اور اب وہ یہ چاہتا تھا کہ جب فضل کے قتل کی خبر عام ہو تو وہ دارالخلافہ سے دور، سفر میں مصروف اور "ملکی دورے" کی مصروفیات میں اس قدر منہمک ہو کہ لوگ اس پر شبہ تک نہ کر سکیں اور یہی سمجھ لیں کہ جن لوگوں کے ساتھ فضل نے زیادتیاں کیں انہی لوگوں یا عربوں نے یہ فعل انجام دیا ہے۔ اسی خیال کو مزید مستحکم کرنے کے لئے

اُس نے، خبر پاتے ہی مجرموں کو گرفتار کرنے کے حکم کے ساتھ قاتلوں کو پکڑنے والے کو دس ہزار اشرفیاں انعام دینے کا بھی اعلان کیا۔ عباس ابن الہیثم نے قاتلوں کو پیش کر دیا۔ یہ چار اشخاص تھے۔ اور مامون کے خدمتگاروں میں شامل تھے۔ یہاں مامون جیسے محتاط شخص سے ایک فاش غلطی ہو گئی وہ یہ کہ اُس نے ان مجرموں سے دریافت کیا کہ "تم نے یہ فعل کس کے ایما سے انجام دیا؟" شاید مامون کا خیال تھا کہ میرے رعب اور خلافت کے دبدبہ کے سامنے کسی قاتل کو زبان ہلانے کی مجال نہ ہو گی وہ یا تو جرم اپنے سر لے لیں گے یا زبان بند رکھیں گے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مامون کا خیال، رعب و ہیبت شاہی کے یقین کے سبب اس طرف نہ جا سکا کہ جب اجل مجرم کے سر پر کھڑی ہو اور تلوار اس کی گردن سے مس کر رہی ہو، سچ اور جھوٹ دونوں کے اظہار میں موت یقینی ہو تو پھر سچ بولنے سے کون گریز کر سکتا ہے چنانچہ وہی ہوا جو اس حالت میں منصور کے ساتھ ہوا تھا۔ چاروں قاتلوں نے صاف طور پر مامون کا نام لیا اور مامون نے فی الفور ان کے قتل کا حکم دیدیا اور پھر اس سازش کی تفصیلات ہمیشہ کیلئے پردۂ خفا میں چلی گئیں۔ لیکن بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ قتل مامون ہی کے ایما پر ظہور میں آیا۔

فضل کا فیصلہ تو آغاز سفر ہی میں بخیر و خوبی ہو گیا۔ فضل کی جگہ اس کے بھائی حسن بن سہل کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ مگر مامون نے پھر بھی بغداد پہنچنے میں تیز رفتاری سے کام نہیں لیا۔ اس نے اپنی مصروفیات میں اضافہ کر لیا اور ایک معمولی بستی میں بھی قیام کو لازمہ بنا لیا تھا۔ ان حالات میں جبکہ وزیر اعظم کے قتل کے حادثہ کے ساتھ وزارت بھی تبدیل ہو گئی تھی امور سیاست میں بھی تبدیلی ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس کے باوجود مامون مطمئن و مسرور بغداد سے بے پرواہ اپنے ارادہ کی تکمیل میں اسی طرح مصروف تھا۔ آخر اُس نے بغداد جلد پہنچنے سے اغماض کیوں برتا؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اُسی حالت میں اپنے منصوبے کے دوسرے حصہ کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اور اُس کی نظر میں یہ کوئی بہتر بات نہیں تھی کہ جب وہ بغداد میں داخل ہو تو حضرت امام رضاؑ اس کے شانہ بشانہ موجود ہوں جو مستقبل کے ولی عہد تھے اور جن کی وجہ سے عباسی ناراض تھے وہ اپنا خلیفہ ابراہیم کو بنا چکے تھے اور مامون سے خلع بیعت پر تیار تھے۔ کیا ایسی حالت میں مامون کا پرجوش استقبال ہو سکتا تھا؟ اور وہ یہ دعویٰ اور اعلان کر سکتا تھا کہ وہی عالم اسلام کا متفقہ

خلیفہ ہے؟ لہٰذا الیقینی امر ہے کہ وہ اسی حالت سفر اور سیاسی مصروفیات کے دوران حضرت امامؑ کو بھی اسی طرح شہید کر دینا چاہتا تھا کہ لوگوں کی نظر میں اس کا دامن پاک رہے یہی سبب تھا کہ مامون نے خراسان روانہ ہوتے وقت نہ تو حضرت امام کو خراسان میں رہنے دیا۔ جہاں آپؑ کے بہی خواہ اور عقیدتمند گردوپیش موجود تھے اور نہ ہی آپ کو بحفاظت مدینہ روانہ کیا۔ جہاں آپ کا گھر تھا عزیز و اقرباء تھے اور کثرت سے آپ کے پیروکار موجود تھے۔ اور یہ خیال کہ مامون آپؑ کو اپنے ساتھ اس لئے لے جا رہا تھا کہ مستقبل کے ولی عہد کو اپنے خاندان اور اہل بغداد سے متعارف کرائے گا تو یہ ایک امر محال و نا بود تھا۔ لہٰذا اس کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ آپؑ کو اثنائے سفر مناسب تدبیر سے شہید کرائے اور اپنا بوجھ ہلکا کر کے بغداد میں داخل ہو اور اہل بغداد سے تعریف و توصیف کے ساتھ اپنا پرتپاک استقبال کرائے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ ایسے نازک اور مخدوش حالات میں مامون بغداد سے دور بغداد کے سیاسی حالات سے بے پرواہ ہو کر ایک سال سات ماہ کی طویل مدت تک دل جمعی اور یکسوئی سے کیونکر اپنے منصوبے کو باطمینان تکمیل تک پہنچا سکتا تھا؟ لیکن بہ نظر غائر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخی حالات و واقعات سے اس امر کا ثبوت مہیا ہو جاتا ہے کہ اس نے پہلے ہی سے خبر رسانی کا ایک خفیہ نظام مرتب اور قائم کر رکھا تھا جس کے ذریعہ لمحہ بہ لمحہ بغداد کی ایک ایک خبر اسے ہر روز اس مقام پر پہنچتی رہتی تھی جہاں وہ مقیم تھا۔ کسی مقام پر قیام کا عرصہ وہ ان خبروں ہی کی روشنی میں کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ کسی مقام پر اس وقت تک ٹھہرتا جب تک کوئی خاص خبر اس تک نہ پہنچ جاتی۔ جب فوجی اہلکاروں نے مامون سے تحریری امان اور تحفظ جان حاصل کرنے کے بعد بغداد کی خبروں کی تصدیق و تفصیل بیان کی تھی تو مامون کو بغداد پہنچنے کا مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ کے پہنچتے ہی حالات درست ہو جائیں گے۔ مامون نے بغداد کا ارادہ کیا اور جوں ہی یہ خبر بغداد پہنچی وہاں مامون کے حق میں حالات بدلنے لگے۔ مامون کو یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ ابراہیم اسی وقت تک خلیفہ ہے جب تک مامون بغداد نہیں پہنچ جاتا۔ یہ یقین کرنے کے بعد ہی مامون نے خفیہ خبر رسانی کا ایک مختصر نظام جاری کیا اور پل پل کی خبریں اسے دوران سفر ملنے لگیں۔ چنانچہ اسے معلوم ہوتا رہا کہ لوگ ابراہیم کا ساتھ چھوڑنے لگے ہیں۔ کوئی بیماری کا بہانہ کر کے ابراہیم سے الگ ہو گیا ہے اور کوئی بغداد

میں مامون کے لئے خفیہ بیعت لینے کا آغاز کر چکا ہے۔ ابراہیم کا بھائی منصور مہدی نے بھی بیعت کر لی ہے اسے یہ خبر پہنچی کہ ابراہیم کی خلافت مدائن پر حمید اور علی بن ہشام قابض ہو گئے ہیں اور ابراہیم کا نامی گرامی فوجی افسر عیسیٰ بن محمد بھی حسن بن سہل سے مل گیا ہے۔ حتیٰ کہ ذی الحجہ ۲۰۳ھ کو سفر ہی کے دوران اسے یہ خبر بھی مل گئی کہ حمید نے ابراہیم کی فوجوں کو شکست فاش دیدی ہے اور ابراہیم روپوش ہو گیا ہے۔ غرض مامون جوں جوں بغداد سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا سیاسی حالات اس کے حق میں بتدریج تبدیل ہونے کی خبریں ملتی جا رہی تھیں اور مامون بقصد اطمینان محو سفر تھا۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے کون صاحب فہم اور تاریخ سے باخبر، اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار کر سکتا ہے کہ مامون بغداد کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ بغداد پہنچنے میں تاخیر اور سفر میں طوالت کا مقصد حضرت امامؑ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے اپنے منصوبے پر یکسوئی سے غور کرنا تھا۔ ہر مقام پر قیام اور وہاں کے سیاسی مسائل کو زیر بحث لانا ایک بہانہ تھا تاکہ لوگ غلط فہمی کا شکار رہیں اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ بغداد میں داخلہ سے پہلے اپنے منصوبہ کو روبعمل لانا چاہتا تھا۔

خفیہ نظام خبر رسانی کا ثبوت ہمیں مامون کے اس عمل سے مل جاتا ہے جس کا ذکر مورخین نے مامون کے بغداد پہنچنے کے بعد اس ضمن میں تفصیل سے کیا ہے اور جس پر علامہ شبلی نعمانی نے بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے چونکہ مامون کو سفر کے دوران خفیہ خبر رسانی کے طریقے سے بڑا فائدہ پہنچا تھا اس لئے بغداد آنے کے فوراً بعد اس نے پورے بغداد اور اس کے گرد و نواح میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا تھا۔ اور اس کی اطلاع سوائے اس کے اور کسی کو نہ تھی۔ وہ ہر لمحہ ہر معمولی سے واقعہ سے باخبر رہتا تھا۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے ایک ہزار سات سو عمر رسیدہ اور تجربہ کار عورتیں ملازم تھیں جو ہر چھوٹے بڑے گھر میں ہونے والی باتیں تک مامون کو پہنچاتی تھیں۔ عام حالات کی اطلاع یابی کا یہ چسکا مامون کو دوران سفر خبر رسانی سے فائدہ حاصل کر کے ہی لگا تھا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

"مامون نے خراسان کے زمانہ حکومت میں غفلت برتی تھی۔ اس کا خمیازہ مدت تک کھینچنا پڑا تھا۔ اس لئے بغداد میں آکر اس کا طرز حکومت بالکل بدل گیا تھا۔ اب اس کو ایک ایک جزئی واقعہ اور عام حالات کا کچھ ایسا

عشق ہو گیا کہ سنکر تعجب ہوتا ہے۔ سترہ سو عجوزہ عورتیں مقرر تھیں جو تمام دن شہر میں پھرتی تھیں اور شہر کا کچا چھٹا اس کو پہنچاتی تھیں لیکن مامون کے سوا کسی کو ان کے نام و نشان سے اطلاع نہ تھی۔ ہر صیغہ پر جدا گانہ خفیہ پولیس اور واقعہ نگار مقرر تھے اور ملک کا کوئی ضروری واقعہ اس سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔" (المامون صفحہ ۱۴۶)

امام علی رضاؑ کی شہادت، اسباب اور دلائل

مامون فضل بن سہل کے قتل سے اپنے سفر کے آغاز ہی میں فراغت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ماہ رجب ۲۰۲ھ میں مرو سے بغداد کی جانب سفر اختیار کیا اور ابھی وہ سرخس ہی تک پہنچ پایا تھا کہ ۲ شعبان ۲۰۲ھ میں یعنی پورا ایک ماہ گزرا تھا کہ فضل قتل کر دیا گیا۔ اور یہ خبر اسے سرخس میں قیام کے دوران ملی۔ اس نے فضل کے خاندان کو پے در پے مراعات دے کر قتل کے یقین کو شبہ سے اس حد تک بدل دیا کہ افراد خاندان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ بہر حال فضل ذوالریاستین کے عام احسانات کو اس نے فراموش نہیں کیا ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ کم سے کم اسے اب بھی وہی ہمدردی ہے جو پہلے تھی۔

اس طرح سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اس نے حضرت امام علی رضاؑ کو شہید کرنے کی جانب اپنی پوری توجہ مبذول کی ہے، ظاہر ہے کہ امام رضاؑ کے حق میں مامون وہ طریقہ استعمال کرنے کی حالت میں ہرگز نہ تھا جو وہ فضل کے قتل میں کر چکا تھا۔ اس طریقہ میں راز فاش ہو جانے کے قوی امکان تھے۔ اس پر پہلے ہی فضل کے قتل کا یقین کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے وہ طریقہ اختیار کیا جس میں سوائے مجرم کے کوئی شئے بھی گواہ نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ قرائن بھی جرم یا مجرم کی طرف کوئی اشارہ تک کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور قتل کا یہ طریقہ زہر خورانی تھا۔ اس وقت جرم کی تحقیق کے سائنسی طریقے موجود نہ تھے موت بتدریج واقع ہوتی اور لوگ اس کا سبب کوئی پوشیدہ و پیچیدہ قدیم بیماری خیال کرتے یا آسانی کسی ایسے مرض کی طرف توجہ دلا دی جاتی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپؑ کو انگور پسند تھے یہ زہر انگوروں میں ملا کر دیا گیا۔ اور یہ واقعہ فضل کے قتل سے صرف سات ماہ

بعد اس وقت پیش آیا جب مامون ایرانی علاقہ میں طوس کے مقام پر جسے سناباذ بھی کہا جاتا تھا مقیم تھا (اس مقام کو آج کل مشہد مقدس کہا جاتا ہے) یہیں مامون کے باپ ہارون کی قبر ہے۔ اسی وجہ سے مامون یہاں ٹھہرا تھا۔ اس قیام کا دوسرا مقصد حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ اسی جگہ قیام کے دوران ایک روز حضرت امامؑ کو کھانے کیلئے انگور پیش کئے گئے یہ انگور زہر آلود تھے۔ انگور کھانے کے بعد ہی آپ کی موت واقع ہوئی۔ اس ضمن میں ابن اثیر کا بیان کیا جا چکا ہے۔ ابن اثیر ہی کے کہنے کے مطابق مامون نے آپؑ کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے باپ ہارون کے پاس دفن کیا۔ بقول علامہ شبلی مامون نے ہارون کی قبر ہی میں حضرت امامؑ کو دفن کرنے کا حکم دیا، وہ ننگے سر جنازہ کے ساتھ گیا۔ زار و قطار رویا اور تین روز تک قبر کا مجاور رہتے ہوئے نمک کے ساتھ ایک روٹی پر اکتفا کئے رہا۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس کی ظاہر داری تھی جس طرح اس نے فضل کے قتل پر اس کے اہل خاندان کو مطمئن کرنے کے لئے ڈھونگ رچایا تھا اسی طرح سادات اور علویوں کو اپنی طرف سے اطمینان دلانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس نے اس سازش کی تکمیل کیلئے پہلے ہی سے یہ مقام تجویز کر رکھا تھا کہ وہ حضرت امامؑ کو ہارون کی قبر میں یا اس کے قریب جگہ دے کر اپنی عقیدت کا اظہار کرے اور اسطرح آپؑ کے اعزا کو مطمئن کر دے کہا جاتا ہے کہ ہارون کی قبر حضرت امام کے قدموں میں ہے اگر واقعی ایسا ہے تو یہ یقیناً ہارون کے حکم ہی سے ہوا ہوگا اور مغالطہ میں ڈالنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سا عمل ہو سکتا ہے جو عین الیقین کا درجہ بھی رکھتا ہو۔

شہادت امام کے بعد مامون کی جانب سے اسی قسم کے دیگر امور و اعمال کے اظہار اور پہلے سے مامون کی نسبت تشیع کی شہرت کی بنیاد پر اہل سنت مورخین نے عموماً اور مامون کو اپنا ممدوح تصور کرنے والے مورخین نے خصوصاً اسے اس سازش سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اپنے اس موقف کی دلیل میں وہ انہی معاملات و معمولات کو پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ مامون کا یہ عمل اُن کیلئے ناقابل برداشت اور سخت پریشانی کا سبب ہے۔ مثلاً

۱۔ مامون نے تمام صحابہ پر حضرت علیؑ کی فضیلت ثابت کرنے کیلئے برسر عام مناظرہ کیا تھا۔

۲۔ مامون نے آپؑ کو اپنا ولی عہد بنایا اور اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی تھی۔

۳۔ اس نے اعلان کیا کہ معاویہ کا ذکر اچھائی کے ساتھ نہ کیا جائے جو ایسا کرے گا اس کا مال اور خون مباح ہو جائے گا اور وہ دائرہ اطاعت سے باہر سمجھا جائے گا۔

۴۔ جو شخص اہلبیت کی تعریف کرتا وہ اسے انعامات سے نوازتا۔

۵۔ اس نے متعہ کو حلال قرار دیا اور کہا کہ اللہ کے حلال کئے کو حرام اور حرام کئے کو حلال کرنے کی کون جرات کر سکتا ہے۔

۶۔ سادات اور علویوں سے درگزر کرنا اور ان کو مراعات دینا وغیرہ۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ مامون کا یہی پریشان کن عمل، ان کیلئے مامون کو بری الذمہ قرار دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے وہ اسے بکراہ برداشت کرتے ہیں، مجبوراً بیان بھی کرتے ہیں اور بخوشی اس کی بریت کیلئے بطور دلیل استعمال بھی کرتے ہیں۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس کے تشیع سے انکار کرتے اور اس کی تردید میں تاویل کرتے۔ شرعی حیل کو درمیان لاتے، ظاہر سے باطن اور یقین سے شک کی طرف رجعت کرتے یا ایک طویل اور لامتناہی بحث سے اسے مختلف فیہ بنا دیتے جیسا کہ حکم متعہ اور فضیلتِ علیؑ سے متعلق بعض جگہ دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ سب کچھ مامون کی علمیت اور حقیقت شناسی کا اظہار تھا اسے مذہبی عقیدے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا علامہ شبلی نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> "وہ حضرت علیؑ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتا تھا لیکن اور خلفاء سے بھی بداعتقاد نہ تھا اس نے ایک نظم میں حضرت عثمان و عائشہ کی نسبت بھی اپنا راسخ اعتقاد ظاہر کیا ہے اس کے یہ خیالات جن کو اب مذہبی اعتقادات کا نام دیا جاتا ہے مختلف زبانوں کی تعلیم و معاشرت کے نتائج تھے۔
>
> (المامون صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹)

رہی سادات و علویوں کے ساتھ مراعات و درگزر کی بات تو یہ وہ قرضہ اکار رہا تھا جو اسکے خاندان پر واجب الادا تھا اور جس کا اس نے خود اقرار کیا تھا۔ گزشتہ صفحات میں اس کا یہ اقرار حوالہ کے ساتھ بیان ہو چکا ہے) اور اس قرض کی ادائیگی بھی اس نے حضرت امام کی وفات کے بعد معطل کر دی

تھی کہ سادات و علویین کا اپنے دربار میں داخلہ تک ممنوع قرار دیدیا تھا۔ وہ جس روز بغداد میں داخل ہوا اسی روز اس نے سادات کا مخصوص سبز رنگ ترک کرنے کا حکم دیا، خود بھی سیاہ لباس پہنا اور درباریوں کو سیاہ خلعتیں عطا کیں اسی روز کل اہل بغداد سبز کے بجائے سیاہ لباس میں ملبس تھے جو عباسیوں کا مخصوص رنگ تھا۔ اس لئے حضرت امام کی وفات سے قبل مامون کے کردار و عمل کو کسی طور اس کی برأت میں دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے بنیاد بنا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امامؑ کا قتل مامون کے ایماء سے نہیں ہوا۔

مامون کے باپ دادا محسن کشی میں تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ ابو مسلم خراسانی وہ شخص ہے جس نے پہلے عباسی خلیفہ "السفاح" کو تخت خلافت پر بٹھایا۔ عباسی خلافت کی بنیاد کو مضبوط اور وسیع کیا۔ لیکن بعد میں اسی محسن عظیم کو قتل کرا دیا گیا۔ تمام خلفائے عباسیہ کا یہ گھناؤنا کردار تاریخ کے صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ منصور کا ایک واقعہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہارون امام موسیٰ کاظم کو قتل کرانے کا مرتکب ہوا تھا۔ ہارون ہی کے زمانہ میں خاندان برامکہ جس نے عباسی حکومت کو مستحکم کیا تھا۔ تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ اور خود مامون نے اپنے بھائی امین کو قتل کرایا پھر فضل بن سہل جیسے محسن کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور اسی مامون نے طاہر کو زہر دے کر ہلاک کرایا۔ یہ دلچسپ واقعہ ہم مختصراً بیان کرتے ہیں تاکہ مامون کے ظاہر و باطن پر روشنی پڑ سکے اور حضرت امامؑ کی شہادت کا راز افشاں ہونے میں مدد مل سکے۔

طاہر، مامون کا وہ سپہ سالار ہے جس نے اسے "امین" سے نجات دلائی اور پھر ابراہیم کی خلافت اور بغاوت کو ختم کر کے مامون کو بغداد میں داخلہ کے لئے راستہ صاف کر دیا، مامون کل عالم اسلام کا خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ انہی احسانات و خدمات کے بدلے میں مامون نے طاہر کو پورے مشرقی علاقہ یعنی بغداد کی حدود سے باہر سندھ تک کے مشرقی علاقہ کا نائب السلطنت، مقرر کیا اور ایک کروڑ درہم بھی عطا کئے گئے۔ یہ سب کچھ لوگوں کو دکھلانے کیلئے خدمت کا صلہ اور طاہر کو اپنا مطیع فرمان رکھنے کے لئے انعام تھا لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی ـــــ طاہر کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر لوگ نالاں تھے۔ شعراء نے نہایت دردناک مرثیے لکھے جس میں مامون کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اور امین کے قتل ہونے پر اس کی ماں زبیدہ خاتون نے مامون کو ورغلایا

خط لکھا جس میں یہ الفاظ بھی تھے " طاہر نے جو کچھ کیا اگر تیرے حکم سے کیا تو خدا کے مقدر پر
میں صبر کرتی ہوں"۔ شعراء نے امین کے مرثیے لکھے جن میں ابو عیسٰی کے اشعار نے مامون کے خلاف
آگ بھڑکا دی۔ خود علامہ شبلی المامون میں لکھتے ہیں:" حسین بن ضحاک ایک شاعر نے جو امین کا ندیم
تھا امین کے قتل کا نہایت جانگداز مرثیہ لکھا۔ جس میں مامون کو بہت کچھ برا بھلا کہا گیا تھا۔ اس
نے نہایت دردانگیز الفاظ میں بغداد کی تباہی کا نقشہ کھینچا تھا۔ اس نے اپنے ایک شعر میں کہا
"بغداد تباہ کیا جا رہا ہے اور آلِ ہاشم کی نازک اور گل اندام عورتیں غارت گروں کے بے رحم ہاتھوں
سے اپنے ناموس کو نہیں بچا سکتیں"۔ اور ایک اور شعر میں یہ مضمون ادا ہوا تھا" خدا کرے مامون
اس کے بعد کبھی سلطنت سے لذت نہ اٹھائے اور ہمیشہ دنیا میں خوار اور مردود رہے"۔ اور ایک
روز تو خود مامون نے جبکہ وہ دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا۔ ایک ملاح کو یہ کہتے ہوئے سنا۔" مامون
جس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا کیا ہماری آنکھ میں عزت حاصل کر سکتا ہے؟ مامون ان تمام باتوں
سے انتہائی متاثر ہوا وہ اس کوشش میں تھا کہ ان اثرات کو کسی طرح عوام کے ذہنوں سے دور کر دے
چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب زبیدہ خاتون کا خط اسے ملا جو اس نے اپنے بیٹے امین کے قتل پر اسے
لکھا تھا تو وہ رو دیا اور کہا" واللہ میں خود اپنے بھائی کا عوض لوں گا"۔ وہی مامون جس نے اپنے بھائی
امین کو قتل کروایا وہی جس نے اس کے قتل کی خبر سنکر سجدۂ شکر ادا کیا۔ وہی جس نے خبر لانے والے
کو گرانقدر انعام سے نوازا اور وہی مامون جس نے سرانجام دینے والوں کے عہدے بڑھا کے
خلعتیں دیں اور نقد انعام دیئے۔ وہی گرد و پیش کے اثرات اور مصلحت وقت سے مجبور ہو کر یہ
کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے حسب عادت سازش تیار کی اور ایک منصوبہ ترتیب دیا، لوگوں
کو دکھانے کے لئے طاہر کا مرتبہ بڑھایا اور خراسان کی حکومت اس کے سپرد کی۔ طاہر جب
خراسان روانہ ہونے سے پہلے مامون سے رخصت ہونے گیا تو مامون نے پہلے سے تیار ایک غلام
اس کی خدمت کیلئے پیش کیا اور یہ یقین دلایا کہ یہ ذہین غلام بھی گویا اس کی کارگزاریوں کے عوض، انعام
صلہ اور تحفہ ہے۔ مگر دراصل یہ غلام نہیں بلکہ جاسوس تھا اور اسے در پردہ ہدایات دیدی گئی تھیں
کہ اگر وہ طاہر میں کوئی باغیانہ تبدیلی محسوس کرے تو اسے فوراً زہر دے کر مار ڈالے۔ ایسا ہی ہوا اور چند
روز کے بعد اطلاع ملی کہ طاہر کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کے بعد مامون نے طاہر کے ایک

بیٹے طلحہ کو خراسان کی حکومت دیدی اور دوسرے بیٹے عبداللہ کو بھی ایک معزز عہدہ پر فائز کر دیا (المامون صـ ۹۲)

اب کون ہے جو طاہر کے قتل کا الزام مامون پر رکھے گا۔ اس وقت مامون بغداد میں تھا اور طاہر خراسان میں۔ لوگ جانتے تھے کہ طاہر مامون کا محسن ہے اور مامون نے اس کی خدمات کو سراہا ہے پھر اس نے طاہر کے دونوں بیٹوں کو بڑے عہدے دیکر اپنے خلوص کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ تاریخ کے اس مسلّم واقعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ کوئی بھی عباسی خلیفہ بالخصوص مامون اگر کسی عظیم محسن کی ذات کو بھی اپنے وقار اور خلافت کے منافی خیال کرتا تو اُسے اپنی راہ سے ہٹانے میں ہرگز پس و پیش سے کام نہیں لیتا تھا۔ اور اسی مقصد کے لئے جو بھی منصوبہ تیار کرتا تھا اس پر عمل کر گزرتا تھا۔ اور اپنے پہلے سازشی منصوبہ کی خامیوں کو سامنے رکھ کر کسی اگلے سازشی منصوبہ کو زیادہ محفوظ اور کامیاب بنا لیا کرتا تھا چنانچہ مامون نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے قتل کا اہم منصوبہ فضل بن سہل سے متعلق بنایا اور اس میں جو فاش غلطی اس سے ہوئی تھی یعنی قاتلوں کی گرفتاری اور ان سے اصل حقائق کی دریافت کو اس نے اپنے دونوں آئندہ منصوبوں میں دہرانے کی غلطی نہیں کی اور یہ دونوں منصوبے، فضل بن سہل کے منصوبۂ قتل کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہے۔

حضرت امام علی رضاؑ کو بظاہر ولی عہد بنانے کا ڈھونگ تو مامون نے اسی لئے رچایا تھا کہ وہ سادات اور علویوں کو اپنی محبت اور خلوص کا یقین دلا کر پے در پے خروج، جابجا بغاوت اور بدامنی پھیلانے سے باز رکھے اور اپنی خلافت کو استحکام دینے کے ساتھ ساتھ ہر خوف و خطر سے محفوظ و مامون اور مصئون بنا دے۔ اور پھر ہر نوع کی قوت حاصل کرنے کے بعد آئندہ کسی بھی سازش کے ذریعہ حضرت امامؑ سے اپنا یا اپنے وارثوں کا پیچھا چھڑا لے۔ مطلب یہ کہ ابھی حضرت امامؑ رضاؑ خلیفہ تو نہ ہوئے تھے نہ وہ اختیارات ان کے قبضہ میں تھے۔ اختیاراتِ خلافت تو مامون کی وفات کے بعد ہی منتقل ہونے تھے بشرطیکہ اس دوران کوئی تبدیلی واقع نہ ہو جائے اور یہ تبدیلی اس کی وفات تک کسی وقت بھی آسکتی تھی۔ لیکن مامون نے اس منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے آلِ عباس کے دلوں میں پوشیدہ رقابت پر نگاہ نہ کی جو وہ موروثی طور پر آلِ علی کے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت امامؑ کے اعلانِ ولی عہدی کے ہوتے ہی وہ برہم ہو گئے یوں مامون کا منصوبہ ناکام ہو گیا

بلکہ وہ اس کے لئے مزید پریشانی کا سبب بن گیا۔ حتیٰ کہ بقول علامہ شبلی "جب مامون کو پورا تجربہ ہو گیا کہ جو خاندان ڈیڑھ سو سال سے خلافت پر قبضہ کرتا آیا ہے وہ کسی طرح اپنے فرضی حق سے باز نہیں آسکتا تو مجبوراً اس نے بھی وہی کیا جو اس کے اسلاف کرتے آئے تھے۔" (یعنی حضرت امامؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔) (المامون صفحہ ۱۵۲)

بعض حضرات اہلبیت سے مامون کی محبت اور ائمہ اظہار سے عقیدت کے بعض واقعات کو ذکر کر کے اور بعض اس کی رحمدلی، رقت قلب اور اس کے عفو و درگزر کو دلیل بنا کر اس الزام سے بری قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مسلمات سے ہے کہ اگر کوئی نیکی کسی جائز مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کی جائے تو وہ نیکی شمار نہیں کی جاتی بلکہ اس نیک عمل کو اس مقصد کا بدل اور معاوضہ قرار دیا جاتا ہے۔ مامون اگرچہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ مجھ کو عفو و درگزر میں جو لطف آتا ہے اگر اسے لوگ جان جائیں تو جرم اور نافرمانی کو میرے پاس تحفے لے کر آئیں۔ یا یہ کہ "مجھ کو عفو میں ایسا لطف آتا ہے کہ اس پر ثواب ملنے کی امید نہیں۔" وہ یہ بھی فخریہ دعویٰ کرتا تھا کہ "بڑے سے بڑا جرم بھی میرے حلم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص سے جو متعدد بار نافرمانیاں کر چکا تھا اس نے کہا۔" تو جس قدر گناہ کرتا جائیگا میں بخشتا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ آخر عفو تجھ کو ٹھکا کر درست کر دے گا۔" بلاشبہ مامون نے عوام و خواص کے سامنے یہ جملے بار بار ادا کئے ہوں گے اور عفو و درگزر کرنے کے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں۔ لیکن ان فخریہ اقوال و واقعات کی قلعی ابراہیم کو معاف کر دینے کے واقعہ سے کھل جاتی ہے۔

یہ وہی ابراہیم ہے جس نے بغداد میں اپنی خلافت کا اعلان کیا اور گرد و نواح کے علاقوں پر قبضہ کے لئے مامونی افواج سے جنگ کرتا رہا۔ مامون اس وقت "مرو" میں تھا اسی شخص کی وجہ سے بغاوتوں نے سر اٹھایا اور اسی سبب سے فضل، طاہر اور حضرت امامؑ کا قتل واقع ہوا۔ پورے آٹھ سال تک ابراہیم مامون کے لئے دردِ سر بنا رہا۔ لیکن جب وہ گرفتار ہو کر مامون کے سامنے پیش ہوا تو مامون نے اسے معاف کر دیا۔ یہ داستان بڑی ہی عجیب، دلچسپ اور مامون کی خواہشات کے راز ہائے سربستہ کو عریاں کر دینے والی ہے۔

مامون جب عراق پہنچ گیا تو اس نے ابراہیم کی گرفتاری کے لئے ایک لاکھ درہم انعام مقرر

کیا۔ ابراہیم روپوش ہو چکا تھا مگر بغداد ہی میں تھا۔ اس نے سنا تو بغداد سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ گرمی کے دنوں میں ٹھیک دوپہر کو گھر سے نکل پڑا، لیکن کہاں جائے؟ ایک گلی میں گیا تو وہ آگے جا کر بند تھی۔ اسی اثناء میں اُسے ایک حبشی غلام دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ ابراہیم نے اس سے کچھ دیر گھر میں رکنے کی التجا کی۔ غلام نے بخوشی منظور کیا اور ایک کمرہ میں بٹھا کر خود باہر چلا گیا اور کھانے کا سامان لے کر حاضر ہوا۔ اور پھر یہ راز فاش ہو گیا کہ اُس نے ابراہیم کو پہچان لیا ہے غلام نے ابراہیم کو محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا لیکن ابراہیم ایک رات وہاں سے چھُپ کر نکل گیا۔ ایک فوجی سوار نے ابراہیم کو پہچان لیا وہ بھاگا اور اس کی دسترس سے نکل گیا۔ پھر وہ اپنی ایک خاص کنیز کے گھر پہنچا تاکہ اس کے گھر پناہ کا بندوبست کرے اور پھر بغداد سے نکل جائے لیکن اس کنیز نے پولیس کو اطلاع دے کر ابراہیم کو گرفتار کرا دیا۔ اس وقت ابراہیم نے خود کو چھپانے کے لئے زنانہ لباس پہن رکھا تھا اسی حالت میں مامون کے سامنے دربار میں حاضر کیا گیا۔ مامون نے دیکھتے ہی کہا "خدا تجھے تباہ کرے" لیکن ابراہیم فوراً بول پڑا۔ "امیر المومنین! ذرا صبر، بے شبہ میں سزا کا مستحق ہوں لیکن تقویٰ عفو کا باعث ہے۔ پھر یہ اشعار پڑھے۔

"میرا گناہ بڑا ہے لیکن تو اس سے بالاتر ہے یا اپنا حق لے یا اپنے حلم سے درگزر کر۔ اگر میرے کام شریفانہ نہیں ہیں تو بالآخر تیرے اعمال تو شریفانہ ہونے چاہئیں؟"

مامون خاموشی سے سنتا رہا۔ اور جب وہ خاموش ہوا تو مامون نے ارکان سلطنت کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا کیا رائے ہے؟ سب نے بالاتفاق قتل کی رائے دی۔ مامون قتل کا حکم دینے ہی والا تھا کہ وزیر اعظم احمد بن ابی خالد نے سفارش کی اور کہا: "تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ بغاوت کے جرم میں باغی کو قتل کیا گیا۔ لیکن امیر المومنین! کیوں نہ تاریخ میں آپ کے حوالے سے ایک نئی مثال قائم کی جائے۔ اگر آپ بخش دیں تو آپ کی فیاضیوں کی نظیر گزشتہ تاریخ میں کوئی فرد نہ پیش کر سکے گا" مامون یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ مامون کی فکر میں غلطاں سر جھکائے دیکھا تو ابراہیم نے فوراً اپنا نقاب الٹ دیا اور کہا: "اللہ اکبر، قسم بخدا امیر المومنین نے مجھے معاف کر دیا" مامون اسی وقت سجدہ میں گر گیا اور دیر تک سربسجدہ رہا۔ پھر ابراہیم سے مخاطب

ہو کر مامون نے کہا۔ "بچا جان آپ جانتے ہیں میں نے کیوں سجدہ کیا؟ ابراہیم نے کہا میری اطاعت پر"۔ مامون بولا، نہیں بلکہ اس لئے کہ خدا نے مجھے عفو کی توفیق دی"۔

مامون کے عفو و درگزر کی یہ تفصیل جسے علامہ شبلی نے "المامون" میں ذکر کیا ہے۔ صاف بتا رہی ہے کہ مامون نے ابراہیم کو صرف اس لئے معاف کر دیا تاکہ تاریخ میں اس کا بے مثال کارنامہ شمار ہو، آئندہ تاریخ میں اس کا نام روشن ہو اور وہ عفو و درگزر میں شہرت حاصل کرے اس کے ساتھ ہی تاریخ میں جو قتل اور ظلم و ستم کی داستانیں اس کے نام پر لکھی جائیں ایسے واقعات ان کی شدت میں کمی کا سبب بن جائیں اور لوگ اس شک و شبہ میں پڑ جائیں کہ مامون جیسا رحیم و کریم شخص بھلا امام وقت کو قتل کرنے کا اقدام کیسے کر سکتا ہے جو اہلبیت سے محبت بھی رکھتا ہو۔ اس معافی کے اور بھی محرکات ہو سکتے ہیں۔ احمد بن ابی خالد کے ان الفاظ کے ساتھ ہی کہ "آپ کے حوالے سے تاریخ میں ایک نئی مثال قائم ہوگی اور آپ کی فیاضیوں کی نظیر تاریخ میں نہ مل سکے گی"۔ مامون کا سوچ میں پڑ جانا اس امر کی علامت ہے کہ اُس نے اپنی اس دائمی تاریخی شہرت کے ذریعہ کو پسند کیا اور پھر اس پر غور اس لئے کیا کہ کیا ایسا کرنے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا اور جب اس نے یہ یقین کر لیا کہ ایسا کرنے سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ بہتری کا امکان ہے تو اس نے معافی دینے کا اعلان کر دیا۔ ابراہیم مامونؔ کا چچا تھا اس نے خوب سوچ لیا تھا کہ اگر اسے معاف کر دیا گیا تو ایک طرف صلہ رحمی ہوگی تو دوسری طرف افراد خاندان خوش ہوں گے۔ اس نے اس پر بھی غور کر لیا تھا کہ اب ابراہیم اطاعت قبول کر چکا ہے۔ اور بغاوت کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ اس کے رفقاء گرفتار ہو کر قتل کئے جا چکے ہیں یہ لوگوں نے اطاعت کر لی ہے اور اب اس کی گرفت خلافت پر مضبوط ہو چکی ہے لہٰذا ابراہیم کو معاف کر دینے میں اس نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا اور نہ ہی کسی نقصان کا امکان پایا۔ یوں تاریخ میں دائمی شہرت بالکل مفت ہاتھ آ رہی تھی جسے اس نے گنوا دینا ہرگز گوارا نہیں کیا۔ رہا مامون کا سجدۂ شکر ادا کرنا تو یہ سجدہ تھا تو واقعی اس لئے کہ اس نے آٹھ سال کی مسلسل تگ و دو کے بعد ابراہیم پر قابو پالیا تھا جیسا کہ خود ابراہیم نے مامون کے پوچھنے پر ظاہر کیا تھا مگر اسے مامون کا توفیق الٰہی قرار دینا ظاہر داری تھی تاکہ لوگ مامون کے اس عمل کو سچائی اور خلوص پر مبنی خیال کریں اور ایسا کرنے میں اس کی مہارت کو مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ اگر ایسے امور کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے یہ کہا جائے تو یقیناً عمومی طور پر قابلِ تحسین عمل ہے لیکن

اطمینان ہوگا کہ "مطلق العنان، آمرِ مطلق اور جابر بادشاہ، خلیفہ یا حاکم کا رحم بھی ظلم کے مترادف ہوتا ہے
اگر اسے مصلحتِ وقت کی میزان میں تولا جائے تو رحم، ظلم کے برابر ہی نظر آئے گا۔ ان کی بے حساب
بخششیں، بیک جنبش لب عفو و درگزر، بیک اشارہ انگشت جاں بخشی اور بیک حرکتِ قلم، پروانۂ حیات
کا اجراء، سخاوت و رحمت کیلئے نہیں ہوتا بلکہ وہ ان ذرائع سے انسانی جانیں خریدتے اور ان کے ضمیر کا
در پردہ سودا کرتے ہیں۔ شاہان میں کوئی واقعی سخی ہوتا ہے اور نہ ہی دراصل رحیم ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس
عمل کو سخاوت و رحمدلی میں شہرت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے
تمام خلفاء سوائے دو کے اس فریب کارانہ سچائی میں ملوث و مبتلا تھے۔ ان میں بنی امیہ کا پہلا خلیفہ
معاویہ بن ابی سفیان اس فریب کا بانی اور زیادہ شہرت یافتہ بیان کیا گیا ہے۔

ان متعلقات اور ان کی حقیقت بیان کرنے سے ہمارا مدعا صرف اس قدر ہے کہ مامون
سے منسوب ایسے تمام واقعات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ، امون حضرت امام علی رضاؑ کا قاتل نہیں
ہو سکتا درست نہیں ہے۔ نہ صرف پیش آمدہ حالات و واقعات اس کی نفی کرتے ہیں، بلکہ خود مامون
کے اقوال بھی اسی کے ایماء پر زہر دئیے جانے کے امکانات کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً

• وہ کہا کرتا تھا کہ "میں دلیل سے غالب ہونا بہ نسبت طاقت سے غالب ہونے کے زیادہ
پسند کرتا ہوں" (المامون ص۱۸۱)

اس کے اس قول میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے کہ وہ جب کبھی ایسا کردہ فعل انجام دیتا تھا
تو اپنے رعب و دبدبہ، ہیبت و قوت اور سزا کے خوف سے لوگوں کی زبانیں بند نہیں کرتا تھا بلکہ وقوع
فعل کے بعد وہ اپنے عمل سے کچھ ایسی دلائل جتیا کر دیتا تھا جس سے لوگ شک و شبہ کا شکار رہ جاتے
اور حتمی طور پر اس کے خلاف بیان نہ دے سکیں گویا وہ اس طرح ان کی رائے پر فیصلہ حاصل کر لیتا تھا

• وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ "آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) وہ جن کی ہر وقت ضرورت
ہے (۲) وہ لوگ جن کی مثال دوا جیسی ہے کہ خاص وقت میں ان کی ضرورت ہوتی ہے اور (۳)
وہ لوگ جو بیماری کی طرح کسی وقت بھی پسندیدہ نہیں ہوتے" (المامون ص۱۸۰)

اُس کے اس قول سے صاف عیاں ہے کہ وہ پہلی قسم کے لوگوں کو اپنے قریب رکھتا انہیں
انعام و اکرام سے نوازتا رہتا لیکن دوسری قسم کے لوگ جو بطور دوا ہوتے انہیں ضرورت کے وقت

استعمال کرتا اور بیماری دور ہو جانے کے بعد ان سے لاتعلق ہو جاتا لیکن اگر یہ لوگ تیسری قسم کی طرح اس کے لئے روگ بن جاتے تو وہ انھیں فنا کر ڈالتا جیسے فضل و طاہر کہ پہلے یہ اس کی ضرورت تھے مگر بعد میں اس کے لئے بیماری ثابت ہوئے چنانچہ اس نے ان دونوں سے چھٹکارہ حاصل کر لیا بالکل اسی طرح جب مامون کی خلافت کو سادات و علویوں کے پے در پے خروج سے خطرہ پیدا ہُوا اور اس نے جب یقین کر لیا کہ علوی کسی طرح اپنے حق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اُس نے حضرت امامؑ کو اس مرض کے لئے بطور دوا وقتی طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کیا انہیں مدینہ سے "مرو" بلوایا اور ان کے ولی عہد ہونے کا اعلان کیا لیکن جب ولی عہدی کی یہی دوا، عباسیوں کی ناراضگی کے سبب اس کے لئے روگ بن گئی تو اس نے ولی عہدی کے روگ کو ختم کرنے کے لئے ولی عہدی کو زہر دے کر ختم کر دیا اور مسائل کی تلاش نہ کرا کے اُس نے شک و شبہ کی دلیل فراہم کر دی اور اس دلیل سے وہ لوگوں کی اپنے خلاف رائے اور بیان پر غالب ہو گیا۔

صرف وہ جملے ہی نہیں جو مامون کی زبان سے وقتاً فوقتاً بطور عادت ادا ہوتے رہے بلکہ ایک ایسی تقریر بھی متعلقہ کتب میں موجود ہے جو اس کے ارادہ اور عادت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ ایک خالص سیاسی تقریر تھی جو اس نے احمد بن داؤد سے ایک خاص موقع پر خطاب کر کے کی تھی۔ اس تقریر کا اختصار علامہ شبلی نعمانی نے رسالہ "حکم و آداب" کے حوالہ سے "المامون" میں نقل کیا ہے۔ اس نے احمد بن داؤد سے کہا۔

"بادشاہ بعض وقت اپنے خاص ارکانِ دولت کے ساتھ جو (سلوک) باتیں کر گزرتا ہے عوام ہرگز اس کا اتفاق نہیں کر سکتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وزیر یا نائب السلطنت نے جو وفاداریاں کیں، ان کے بارے میں حکومت کی گردن کبھی ہلکی نہیں ہو سکتی وہ بے تکلف رائے قائم کر لیتے ہیں کہ بادشاہ نے جو کچھ کیا صرف حسد یا تنگ دلی کی وجہ سے کیا لیکن ان کو کیا معلوم ہے کہ اس کے بعض افعال خود سلطنت کے خانہ برانداز ہیں۔ اب بادشاہ دو مجبوریوں میں گھر جاتا ہے نہ اس راز کو عوام پر ظاہر کر سکتا ہے نہ اس کے وزیر یا نائب سے درگزر کر سکتا ہے مجبوراً وہ کر گزرتا ہے جو ظاہر میں نہ کرنا چاہیئے۔ وہ جانتا ہے کہ عوام تو کیا خواص بھی اس کو معذور نہ رکھیں گے، لیکن ضرورتاً

کسی کی نکتہ چینی کی پرواہ نہیں کر سکتے"۔ (المامون صـــ ۱۵۳)

احمد بن داؤد سے مامون کی اس گفتگو میں "وزیر" اور نائب السلطنت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یقیناً وزیر سے مراد فضل بن سہل ہے اور نائب السلطنت کا اشارہ طاہر کی جانب ہے۔ ان دونوں کو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مامون نے قتل کروا دیا تھا۔ گفتگو کا انداز ظاہر کر رہا ہے کہ مامون احمد بن داؤد کے سامنے ان دونوں کے قتل کی صفائی پیش کر رہا ہے۔ وہ بادشاہِ وقت کی مجبوری کو قتل کا جواز ٹھہرا رہا ہے اور اسے صحیح قرار دیتے ہوئے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ "ضرورت کسی کی نکتہ چینی کی پرواہ نہیں کرتی اور اسی ضرورت سے مجبور ہو کر بادشاہ وہ سب کر گزرتا ہے جو اسے ظاہر میں نہیں کرنا چاہیئے"۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ مامون کے اس اقرارِ قتل میں حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے لیکن اس امر سے بھی کوئی قاری انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے بیان سے جو فضل اور طاہر کے قتل سے متعلق ہے حضرت امامؑ کو زہر دے کر شہید کرنے کا وہ اہم سبب معلوم ہو جاتا ہے جس نے فضل اور طاہر کو قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مامون نے فضل اور طاہر دونوں کے قتل کا ایک ہی سبب "سلطنت کی خاطر برداری" بیان کی ہے اور ان دونوں کا قاتل وہ خود ہے۔ اب اگر یہی سبب حضرت امام رضاؑ کی شہادت کا بھی ہو تو ان کا قاتل بھی وہی ایک مامون ٹھہرتا ہے جس طرح ایک سے زائد وارداتوں میں طریقۂ واردات یکساں ہو تو ان تمام وارداتوں کا ذمہ دار ایک ہی وہ شخص ٹھہرتا ہے جو اس طریقہ کو استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اسی طرح ایک سے زائد قتل کا اگر ایک ہی سبب ہو تو ان سب کا قاتل وہی ایک شخص ہے جس نے اس سبب کی بنیاد پر ایک قتل کیا ہو، سببِ قتل کا مشترک ہونا قاتل کے مشترک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ فضل اور طاہر کا قتل ایک وجہ سے مامون نے کیا تھا اور وہی ایک وجہ حضرت امام رضاؑ کی شہادت میں بھی پائی جاتی ہے لہٰذا آپ کا قاتل مامون کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

تاریخیں موجود ہیں، تاریخ داں جانتے ہیں کہ فضل بن سہل نے مامون کے لئے خلافت کی راہیں صاف اور استوار کیں جس کے صلہ میں اُسے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ ملا۔ لیکن جب عربوں کی ناراضگی کے سبب یہی فضل اسی خلافت کیلئے خطرہ بن گیا تو اس نے اسے قتل کرا دیا۔ یہی طاہر جس نے مامون کے راستے سے "امین" کو ہٹایا پھر بغاوتوں کو ختم کر کے مامون کی خلافت اس کے حق میں مستحکم کر دی

تو اس نے طاہر کو ان خدمات کے بدلے پورے جنوبی علاقہ کا نائب السلطنت بنادیا۔ مگر جوں ہی طاہر کی طرف سے اسے اپنی خلافت کو خطرہ محسوس ہوا اس نے اسے زہر دلوا کر مروا ڈالا۔ بالکل اسی طرح مامون نے حضرت امام علی رضاؑ کو اپنا ولی عہد قرار دے کر سادات وعلویوں کو خروج سے روکا مگر جب یہی ولی عہدی عباسیوں کی ناراضگی کا سبب بن کر اس کی خلافت کے لئے خطرہ بن گئی تو اس نے آپؑ کو زہر دے کر شہید کر ڈالا۔ ان تینوں اشخاص کے قتل کی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ ہے مامون کی خلافت کی خانہ برانداذی لہٰذا وہ اپنے ہی الفاظ میں دو مجبوریوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ ایک یہ کہ وہ اس راز کو عوام پر کیسے ظاہر کرے اور دوسرے یہ کہ وہ ان اشخاص سے درگزر کیونکر کرے۔ چنانچہ اس ضرورت کے سامنے وہ کسی نکتہ چینی کی پروا کئے بغیر وہ کچھ کر گزرا جو اسے ظاہر میں نہ کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی فضل بن سہل، امام علی رضاؑ اور طاہر کا قتل، جب مامون کے الفاظ، اس کے اقوال اور اسی کے بیانات اسے قاتل ثابت کر رہے ہوں تو ہم کس طرح اس کے قاتل ہونے میں شک وشبہ کر سکتے ہیں؟

ان حقائق کے علاوہ تاریخ میں وہ ایسے وقو - ملتے ہیں جو صریحاً مامون ہی کو حضرت امامؑ کا قاتل ثابت کرتے ہیں اور یہ وہ واجبات ولازمات ہیں جن کی ادائگی سے مامون نے عمداً گریز کیا تھا۔

(۱) مامون نے اہلبیت کی محبت وعقیدت اور سادات کا حق سمجھتے ہوئے اور یہ تجربہ و امتحان کر لینے کے بعد کہ عباسیوں میں اس وقت کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو خلافت کا بارِ گراں برداشت کر سکے یا جو استحقاقِ خلافت، زہد واتقا اور فضل وکمال میں حضرت علیؑ کا ہمسر ہو حضرت امامؑ کو مدینہ سے بلا کر ولی عہد خلافت ہونے کا پوری مملکت اسلامیہ میں اعلانِ عام کرایا، ابن اثیر اور طبری کے مطابق اسی سبب سے اس نے اپنی بیٹی ام حبیب کی شادی جناب امامؑ سے کی اور دوسری بیٹی ام الفضل کو آپکے بیٹے حضرت محمد تقی الجوادؑ کو بیاہا۔ لیکن چند ہی ماہ بعد، مرو سے بغداد کی طرف سفر کے دوران طوس کے مقام پر اچانک آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس انتقال کا سبب زہر آلود انگور بتلائے جاتے ہیں۔ مگر اس امر کی وضاحت نہیں کی جاتی کہ یہ زہر کس کے ایما سے کس نے ملایا؟ بقول ابن اثیر رائے عامہ مامون کے خلاف تھی اور یہ الزام مامون کی ذات سے وابستہ کیا گیا تھا۔ لیکن اگر

یہ فرض کر لیں کہ حضرت امام کی شہادت میں مامون کا ہاتھ نہ تھا وہ اس سازش سے بے خبر تھا سادات سے محبت و عقیدت رکھتا اور حضرت امام کو افضل جانتے ہوئے انہیں خلافت کا اہل اور حقدار سمجھتا تھا تو اس کے لئے واجب تھا کہ وہ آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کے بیٹے کی ولی عہدی کا اعلان کر کے اس نقصان کا ازالہ کرتا ایسا کر کے نہ صرف وہ سازشیوں کی چال کو ناکام بنا دیتا بلکہ اپنے خلوص و عقیدت اور سچائی کا بھرپور مظاہرہ بھی کرتا۔

یہ بات بھی مسلمات سے ہے اور علامہ شبلی نے بھی "المامون" میں لکھا ہے کہ بنی امیہ اور عباسیہ دونوں نے اپنے طریقِ عمل سے خلافتِ اسلام کو خاندانی ترکہ قرار دے رکھا تھا۔ محمد بن عیسیٰ نے اپنی کتاب "اثبات الوصیہ" میں لکھا ہے کہ امام علی رضاؑ نے مدینہ سے "مرو" روانہ ہوتے وقت اپنے بیٹے محمد تقی الجوادؑ کو اپنے بعد اپنا جانشین بنا دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ میرے بعد اس کی اطاعت کی جائے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مامون نے اپنی ایک بیٹی کی شادی امام محمد تقی علیہ السلام سے کر دی تھی۔ اس طرح ولی عہدی کا پورا حق حضرت امام محمد تقیؑ کو پہنچتا تھا اور مامون کے لئے لازم تھا کہ وہ امام علی رضاؑ کی وفات کے بعد امام محمد تقیؑ کی ولی عہدی کا اعلان کرتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس نے اپنا یہ فریضہ کسی طور ادا نہیں کیا۔ اس حقیقت تامہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مامون نہ تو اپنے اس عمل میں مخلص تھا اور نہ ہی اس سازش سے لاتعلق تھا۔ وہ ایک مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے دوسری ویسی ہی مصیبت کو کیسے گلے لگا سکتا تھا؟

(۲) کوئی تین ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ جب خود مختار شخصی حکومتیں وجود میں آنے لگیں تو عوام نے اپنی جان و مال کی ذمہ داری حکمران کی طرف منتقل کرنا شروع کر دی چونکہ عوام اس کی حکمرانی تسلیم کرتے اور وقت آنے پر اس کی حکومت کو بچانے کے لئے دشمن سے جنگ کرتے اس لئے اسی وقت سے حکمرانوں نے رعایا کی جان و مال کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ کوئی حکمران بادشاہ، خلیفہ یا ذمہ دار حاکم ایسا نہیں گزرا جس نے اس ذمہ داری سے انکار کیا ہو یا اس کے پورا کرنے میں اغماض برتا ہو جرم ہونے پر مجرم کو تلاش کر کے اسے سزا تک پہنچانا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ قاتل کو تلاش کر کے گرفتار کرنے اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کسی بادشاہ یا خلیفہ نے لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔ اگر کوئی بادشاہ یا خلیفہ ایسا کرتا تو اس سے تین باتوں کا اظہار ہوتا تھا یا وہ قتل اس کے ایما سے ہوتا وہ قاتل

وسیلے سے بچا لیا جاتا یا پھر وہ مقتول سے دشمنی رکھتا تھا اس لئے وہ مجرم کو سزا دینے میں تعطلی سے کام لیتا۔ تاریخ ایسی مثالیں بھی پیش کرتی ہے کہ بادشاہ یا خلیفۂ وقت نے ایسے قاتلوں کو بھی گرفتار کرکے قتل کرایا جنہیں خود اس نے قتل کرنے پر مامور کیا تھا۔ محض اس لئے تاکہ عام لوگ ان تین الزامات کا شبہ اس پر نہ کریں اور وہ خود عوام کی نظر میں فرائض کو پورا کرنے والا منصف مزاج حکمران کہلائے جیسا کہ منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ اور خود مامون نے فضل بن سہل کے قاتلوں کے ساتھ کیا تھا۔ جب یہ حال ہو کہ عباسی خلیفہ خود کو قتل کے الزام سے بچانے کے لئے اپنے ہی مقرر کردہ مجرموں کے خلاف تحقیق کا حکم دیں۔ انہیں گرفتار کرنے پر انعام کا اعلان کریں اور پھر انہیں سزا کے طور پر قتل بھی کرادیں تو کیا ان حالات میں انتہائی تعجب و حیرت کی بات نہیں ہے کہ خلیفۂ وقت مامون الرشید عباسی کا محبوب، وقت کا امام، تمام عباسیوں اور علویوں میں برگزیدہ، خلیفہ کا جانشین اور اس کا مقرر کردہ ولی عہد خلافت اس کی اپنی حفاظت میں ہم رکاب رہتے ہوئے زہر دے کر ہلاک کردیا جائے اور وہ نہ تو اس حادثہ کی تحقیق و تفتیش کرے نہ قاتل کو گرفتار کرنے کا حکم دے اور نہ ہی اس کی گرفتاری پر انعام کا اعلان کرے۔ بس چند آنسوؤں بہائے۔ جنازہ کے ساتھ جائے اپنے باپ کی قبر کے قریب دفن کا حکم دے کر تین روز مجاوری کرے اور بس، اپنے منصبی فریضہ سے سبکدوش ہو کر سیاسی ملکی میں مصروف ہو جائے۔ تاریخ یہ مسلم خبر دے چکی ہے کہ مامون نے اس حادثہ کے بعد قاتل کی کوئی چھان بین نہیں کی اور نہ ہی قاتل کی تلاش اور سزا میں کوئی اقدام کیا بلکہ اس کے علی الرغم بغداد میں عباسیوں کو بطور خوشخبری خط لکھا، "تم جس کے سبب مجھ سے ناراض تھے، وہ فوت ہوا، اب کیا چیز ہے جس کی تم شکایت کر سکتے ہو لہٰذا میری اطاعت میں لوٹ آؤ" اور جب وہ بغداد میں داخل ہوا تو اس نے سبز لباس اتار کر سیاہ لباس جو عباسیوں کا نشان تھا زیب تن کیا اور سبز رنگ کو ترک کر دینے کا حکم عام جاری کر دیا، اس کے کچھ عرصہ بعد سادات اور علویوں کو دربار میں آنے کی ممانعت کردی۔

لہٰذا مامون خود مختار خلیفۂ وقت ہوتے ہوئے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے فریضہ سے چشم پوشی کے سبب ان تین یقینی الزامات سے کسی طور نہیں بچ سکتا یا وہ خود زہر خورانی کی سازش میں شامل تھا یا اس نے قاتل کو تحفظ فراہم کیا یا پھر وہ مقتول سے در پردہ دشمنی رکھتا تھا۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مامون نے امامؑ کے قاتل کو تلاش اور گرفتار کرنے کا حکم کیوں نہ

نہیں کیا؟ اسی لئے کہ منصور الیاس کے مجرمانہ شرمندگی سے دوچار ہو چکا تھا اور خود مامون فضل بن سہل کے قاتلوں کو گرفتار کرکے قاتل ثابت ہوا تھا کیونکہ منصور اور مامون دونوں نے خود قتل کا حکم دیا تھا اور قاتلوں نے بروقت یہ راز منکشف کر دیا تھا۔ مامون کا یہ خیال کہ بے مایہ قاتل رعب شاہی سے زبان نہ کھول سکیں گے بالکل غلط ثابت ہوا تھا اور اسی بدنام کن تجربہ کے پیش نظر مامون نے طاہر کے قاتلوں کی بھی تلاش نہیں کی تھی کیونکہ تحفہ میں دیئے جانے والے غلام کو مامون ہی نے طاہر کے قتل پر مقرر کیا تھا اور اسے ہدایت کر دی تھی کہ یہ کام وہ زہر کے ذریعہ انجام دے تاکہ اس کا سراغ بآسانی نہ مل سکے۔ حضرت امامؑ کی شہادت بھی زہر خورانی سے ہوئی اور مامون نے اتنے اہم حادثہ کی بھی تحقیق نہیں کرائی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زہر مامون ہی کے ایماء سے دیا گیا تھا اس نے قاتل کو دکھاوے کے طور پر بھی اس لئے گرفتار نہیں کیا کہ اسے گزشتہ تجربہ کی بنیاد پر راز فاش ہونے کا شدید خطرہ تھا اس لئے شیعوں کا یہ فیصلہ درست اور اٹل ہے کہ حضرت امام علی رضاؑ کا قاتل مامون ہی ہے۔ ہم نے یہ دو واقعاتی ثبوت چیلنج کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

اگرچہ اہل سنت کے مورخین و محققین نے مامون کو اس الزام سے بچانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے کمزور قلم سے نکلے ہوئے کمزور الفاظ ان کے اس موقف کو واضح اور قوی کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ مامون کا تشیع اس کی واضح دلیل نہیں بن سکا۔ مامون کا ایک عمل دوسرے عمل کی صاف طور پر تردید کرتا رہا۔ یہ بات بھی تاریخ کی نظر میں واضح ہے کہ مامون نے عربوں اور عباسیوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ ان کو خوش کرنے اور اپنی خلافت بچانے کے لئے اپنے ہی قول و فعل کی تردید کر چکا تھا یہی سبب ہے کہ اس کی صفائی میں بات کرنے والے محقق و مورخ کوئی بات پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکے۔ جن لوگوں نے اس موضوع پر دلائل دینے کی کوشش کی وہ کمزور قابل تردید اور پوچ دلائل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بعض نے اس موضوع پر خاموشی اختیار کی۔ بعض صرف شک و شبہ پر اکتفا کر گئے۔ بعض نے اس الزام کو دوسروں کے سر ڈالنا ہی مناسب خیال کیا اور بعض غیر جانبدارانہ تجزیہ سے مامون کو کچھ فائدہ پہنچانے میں بہتری سمجھ سکے۔ اس قسم کی تمام بحثیں باہم متصادم اور ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں ہاں ان میں جو بات مشترک اور بہت صاف ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی مامون کا قاتل ہونا صاف و صریح الفاظ میں قبول نہیں کیا ہے

لیکن کوئی نہیں جانتا کہ جھوٹ کے ہزار پردوں میں سے کبھی سچ جھلکتا ہے۔ شک سے یقین پیدا ہوتا ہے اور باطل بہرحال حق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان مؤرخ محققوں میں علامہ شبلی نعمانی سے بڑھ کر کون ہو گا جو مامون کو قتل کے اس الزام سے بری کرنے میں کوشاں ہو خلفائے بنی عباس میں انہوں نے صرف مامون کو اپنا ہیرو تسلیم کیا ہے اس کے باوجود وہ خود اس کی صفائی میں کوئی وزنی دلیل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اور بعض جگہ وہ اپنی اس ناکامی کا غیر شعوری طور پر اقرار بھی کر گئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فضل کے قتل کے بارے میں لکھتے ہیں: "گو تمام واقعات شہادت دے رہے تھے کہ ذوالریاستین کا قتل مامون کے ایماء سے ہوا مگر مامون نے اپنی متعدد کارروائیوں سے اس یقین کو شبہ سے بدل دیا (المامون ص۸۱) تمام اہلِ سنت مورخین نے چونکہ فضل اور طاہر کا قتل مامون کے حکم سے کیا جانا تسلیم کر لیا ہے اسلئے علامہ شبلی کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے اور اوپر کی عبارت میں اس کا اظہار موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسری جگہ وہ مامون کی طرف سے صفائی پیش کرتے اور فضل کے قتل کو "معترض" کا مامون پر الزام بتاتا ثابت کرتے نظر آتے ہیں اور "معترض" سے انہوں نے شیعہ فرد مراد لیا ہے۔ "حضرت علی رضا" کو کس کے ایماء سے زہر دیا گیا؟ وہ اسے تاریخی سوال قرار دے کر کہتے ہیں "مگر ایک خاص فرقے نے اس واقعہ پر مذہبی رنگ چڑھا لیا ہے۔" اور ان کی نظر میں یہ خاص فرقہ شیعہ ہیں چنانچہ وہ صاف طور پر لکھتے ہیں۔

"شیعہ بلا استثناء اس بات پر متفق ہیں کہ خود مامون نے زہر دلوا دیا۔ افسوس ہے کہ ہم کو شیعوں کی تاریخی تصنیفات نہیں ملیں کہ ہم اس بحث کو دونوں فریق کی روایتوں کے لحاظ سے فیصل کر سکتے۔ تمام وہ بڑی بڑی تصنیفیں جن کو دنیا نے اسلام کی تاریخ کا لقب دیا ہے سنیوں ہی کی تصنیفیں ہیں اور بظاہر ان میں مذہبی حیثیت کا خاص لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کی نسبت ہم کو انہی کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایک مورخ نے بھی مامون پر یہ الزام لگانے کی جرات نہیں کی ہے۔ بلکہ علامہ ابن اثیر نے صاف لفظوں میں اس غلط خیال پر استعجاب ظاہر کیا ہے۔

(المامون ص۸۴)

علامہ نے صاف الفاظ میں شیعوں کی کوئی تاریخی تصنیف نہ ہونے کا اقرار کیا ہے اور اس پر افسوس
کا اظہار طنز خفی کے معنی میں آتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ تمام بڑی بڑی تاریخی تصنیفات
جو اسلامی تاریخ ہونے کی سند حاصل کر چکی ہیں سنی مورخین کی ہیں۔ ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے
ہیں کہ پوری پانچویں صدی ہجری تک کسی شیعہ نے کوئی اسلامی تاریخی کتاب تالیف یا تصنیف نہیں کی اور
تاریخی ہی کیا کسی اور متعلقہ موضوع پر بھی انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور وہ لکھتے بھی کیسے؟ جب ان
کے ہاتھ قلم ہوں اور زبانیں بریدہ۔ جب ان کی نقل و حرکت پر پابندی ہو اور ملاقات پر قدغن جو
خود کو شیعہ کہے اسے قتل کر دیا جائے۔ یا اس کا گھر نذر آتش کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے۔ مدینہ
اور کوفہ کے علویین پر مسلسل ظلم و تشدد کے بعد انہیں شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سلطنت
مروانیہ سے عباسیوں کی حکومت تک رہا۔ عباسی خلافت کی ابتداء میں یہی سلسلہ عبداللہ بن معاویہ بن
عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کے قتل سے شروع ہوا اور پھر خراسان، سجستان اور اصفہان میں علویوں
پر جاری رہا۔ وہ شیعوں کو ڈھونڈھ کر قتل کرتے۔ عباسیوں کے قید خانے سادات اور علویوں سے بھرے رہتے
انہوں نے شیعوں کا خون مباح کر دیا تھا۔ جو کوئی اپنے بیٹے کا نام علی رکھتا اسے قتل کر دیا جاتا۔ شعرائے
قریش جو حضرت علی کی شان میں ہجویہ اشعار کہتے انہیں انعام سے نوازا جاتا وہ اشعار عوام میں فروغ پاتے
اور ان کے اشعار کو واقدی اور وہب جیسے مؤرخ روایت کرتے اور وہ شیعہ شعراء جو حضرت علیؑ کی مدح کرتے
اور ائمہ کی شان میں قصیدے لکھتے ان کی زبانیں قطع کر دی جاتیں۔ ان کے دیوان جلا دیئے جاتے تھے
جیسا کہ عبداللہ بن عمار البرقی کے ساتھ کیا گیا اور جس طرح منصور بن الزبرقان کی قبر اسی وجہ سے اکھاڑ
پھینکی گئی اور دعبل بن علی الخزاعی پر اسی وجہ سے ظلم کیا گیا کہ وہ ائمہ خصوصاً امام علی رضاؑ کی شان میں
قصیدہ گوئی کرتا تھا غرض کوئی شیعی قتل ایسا نہ تھا جس میں خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباسیہ
میں سے کسی کا ہاتھ نہ ہو۔ (دیکھئے رسائل خوارزمی)

جب یہ حالت ہو کہ شیعہ صدیوں تقیہ کی حالت میں زندگی گزاریں جو زبان سے ایک لفظ بھی ادا
نہ کر سکیں تو بھلا وہ کیونکر تاریخ کی کتابیں مرتب کر سکتے تھے اگر وہ ایسا کرتے بھی تو کیا ان کی تاریخ اور
وہ خود اس دنیا میں باقی رہ جاتے۔ یہ مسلمہ حقیقت بھی اس ضمن میں شیعوں ہی کے حق میں اس امر کی
محکم دلیل بن جاتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ اہلسنت کی انہی تاریخوں کے حوالے سے کہا جو دنیا سے

"اسلامی تاریخ" ہونے کی سند حاصل کر چکی تھیں اور یہ صرف شیعہ ہی نہیں خود علامہ شبلی بھی یہ بات ماننے پر بصد اکراہ مجبور ہیں کہ قتل مامون ہی کے ایماء سے ہوئے تھے جہاں تک ان کا یہ کہنا ہے کہ کسی مورخ نے بھی مامون پر یہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کی ہے اور علامہ ابن اثیر نے اس پر استعجاب کا اظہار کیا ہے۔" ہم اس کے جواب میں صرف اسی قدر کہیں گے کہ کوئی مورخ آخر اس کی جرأت کر بھی کیسے سکتے تھے وہ تو مامون کو اس فعل سے لاتعلق ثابت کرنے پر مصر رہے ہیں۔ زیادہ تر ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ مامون کو شیعہ ثابت کریں اسی کوشش کا اظہار و اثبات علامہ شبلی کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ چونکہ مامون شیعہ تھا اس لئے لوگ یہ سمجھ لیں کہ وہ شیعوں کے امام کو کیسے قتل کرا سکتا ہے اور اگر یہ تاثر قائم نہ ہو سکے تو وہ اس کے ذیلی تاثر سے خالی نہ رہیں۔ گویا وہ یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کرتے کہ امام علی رضاؑ کو مامون عباسی نے زہر دلوایا مگر یہ کہنا ضرور چاہتے ہیں کہ ایک عباسی شیعہ نے اپنے امام کو قتل کرا دیا، ابن اثیر کے استعجاب کی وضاحت ہم گزشتہ کسی صفحہ پر کر چکے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے آگے لکھتے ہیں۔

> "مامون الرشید کے زمانہ سے نہایت قریب تر تاریخ جو آج دستیاب ہے ابن واضح عباسی کی تاریخ ہے یہ مصنف مامون کے زمانے کے واقعات ان لوگوں کی زبانی روایت کرتا ہے جو خود مامون کے عہد میں موجود تھے۔ ہم اس کی تاریخ میں شیعہ پن کا اثر بھی پاتے ہیں تاہم اس نے مامون کی بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی نسبت بیان کی ہے۔"
>
> (المامون صفحہ ۹۳)

حیرت کی بات ہے کہ علامہ صاحب اپنے موقف کی حمایت میں ان بڑی بڑی (تاریخی) تصانیف کو چھوڑ کر جن کو دنیا نے "اسلامی تاریخ" کا لقب دیا ہے۔ صرف ایک اور وہ بھی غیر معروف مورخ کی چھوٹی سی تاریخ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ مامون کے عہد سے قریب کی تاریخ ہے اور اس کے راوی بقول علامہ شبلی وہ لوگ ہیں جو اس عہد میں موجود تھے۔ اس بات کو صحیح ماننے کے باوجود اسے معتبر کیسے مانا جا سکتا ہے جبکہ اس کا مرتب ایک عباسی ہے اور اس کے عہد کے راوی بھی

عباسی ہیں۔ جب یہ ثابت ہے کہ غیر عباسی سنی مورخوں نے مامون پر اس الزام کی تردید میں کوشش کی ہے تو پھر ایک ابن واضح نامی عباسی اور سنی مورخ تائید میں بیان قلم بند کر سکتا ہے؟ ہمارے اس موقف کی تائید خود علامہ صاحب نے کر دی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں: "تاہم اس (ابن واضح) نے مامون کے بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی نسبت کی ہے" یعنی اس نے عمداً مامون کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ دیگر مورخین نے مامون کو بچایا ضرور ہے مگر علی بن ہشام یا کسی دوسرے شخص کو اس میں ملوث نہیں کیا ہے اور اس کو کیا کہا جائے کہ علامہ شبلی نے اپنے بیان کی تائید میں نہ تو ابن واضح کی تاریخ سے کوئی اقتباس دیا ہے نہ معتبر راویوں کے نام دیئے ہیں اور نہ ہی خود کوئی دلیل قائم کی ہے آخر کس دلیل سے یہ مان لیا جائے کہ ابن واضح عباسی نے سچائی سے کام لیا ہے؟

ہم پہلے مدلل طور پر لکھ چکے ہیں کہ مامون کے حامی مورخین نے مامون کے تشیع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ علامہ شبلی نے بھی مامون کی شیعیت کو اس کی صفائی میں پیش کیا ہے۔ تشیع سے فائدہ اٹھانے والی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب علامہ شبلی اسی ذریعہ کو ابن واضح عباسی کی غیر واضح بدگمانی کا یقین دلانے کیلئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ "ہم اس (ابن واضح عباسی) کی تاریخ میں شیعہ پن کا اثر بھی پاتے ہیں تاہم اس نے مامون کی بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی نسبت کی ہے۔" یہاں علامہ شبلی کہنا چاہتے ہیں کہ ابن واضح شیعہ ہے یا اس کی تاریخ میں شیعہ پن کے اثرات ہیں اس کے باوجود اس نے مامون کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ ظاہر ہے انہوں نے شیعیت ہی کو یہاں بھی مامون کے حق میں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کی تاریخ میں شیعہ پن کے اثرات پائے جانے پر انہوں نے کوئی دلیل دی اور نہ ہی اس سے کوئی مثال پیش کی ہے۔

علامہ شبلی اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے آگے لکھتے ہیں۔

"مامون نے حضرت علی رضاؑ کو ولیعہد خلافت مقرر کیا تو اس سے اس کو کوئی سازش مقصود نہ تھی۔ حضرت علی رضاؑ کوئی ملکی شخصیت نہ تھے اور نہ ان سے حکومت عباسیہ کو کسی خطرہ کا احتمال تھا۔ جیسا کہ شیعوں کا دعویٰ ہے۔ مامون کو اہلبیت کے ساتھ جو دلی خلوص تھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ حضرت علی رضاؑ کے بعد مامون کا طریق عمل سادات کے ساتھ کیا رہا؟ اس خاص حیثیت

سے مامون کے ان تمام حالات اور واقعات کو ترتیب دو جو حضرت علی رضاؑ کی وفات سے پہلے اور پیچھے پیش آئے یہ مرتب اور نتیجہ خیز سلسلہ خود بتادیگا کہ مامون پر یہ غلط اتہام ہے۔ بے شبہ مامون کے خاندان والے حضرت علی رضاؑ کی ولی عہدی سے ناراض تھے انہیں میں سے کسی نے یہ بیہودہ حرکت کی ہوگی؟ (المامون ص ۸۴)

علامہ شبلی نعمانی کا شیعوں کے اس دعویٰ کو غلط قرار دینا درست نہیں ہے کہ امام علی رضاؑ کو ولی عہد قرار دینے میں مامون کی سازش تھی اور یہ کہ ان سے حکومت عباسیہ کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ جب مامون نے امام رضاؑ کو ولی عہد بنایا اس وقت بظاہر کسی سازش کا گمان نہیں تھا۔ یہ بھی مانا جاسکتا ہے کہ حضرت امام جیسے گوشہ نشین، متقی اور پرہیزگار شخص سے حکومت عباسیہ کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا لیکن سازش اور خطرہ کا عمل یہیں تو ختم نہیں ہو جاتا۔ مامون کا یہ اقدام تو اس وقت سازش اور فریب ثابت ہوتا اور امام کی ذات اس وقت حکومت عباسیہ کے لئے خطرہ بن جاتی ہے جب ولی عہدی کا اعلان عباسیوں کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے، اور وہ مامون کی بیعت توڑ کر ابراہیم کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ بغداد اور اس کے گرد و نواح میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور مامون کے لشکر حسن بن سہل اور طاہر کی سرکردگی میں، ابراہیم کی فوجوں سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔ عباسیوں کو یقین تھا کہ اگر خلافت آلِ علیؑ میں ایک بار چلی گئی تو عباسی ہمیشہ کے لئے حکومت سے محروم ہو جائیں گے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور خطرہ حکومت عباسیہ کو امام کی ذات سے ہو سکتا ہے؟ سازش کو ظاہر کرنے والے واقعات اور خطرات کا ذکر تمام مورخوں حتیٰ کہ خود علامہ شبلی نے بھی کیا ہے مگر نہ جانے کیوں یہاں انہوں نے اغماض سے کام لیا ہے وہ خود آگے چل کر اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"چونکہ ذوالریاستین اور حضرت علی رضاؑ کی وفات نے اہل بغداد کی کل شکایتوں کا فیصلہ کر دیا۔ مامون نے بغداد کے لوگوں کو ایک خط لکھا کہ "اب کیا چیز ہے جس کی تم شکایت کر سکتے ہو، مگر مامون کو خلاف توقع اپنی تحریر کا سخت جواب ملا" (المامون ص ۸۵)

کیا شبلی صاحب کے ان الفاظ میں اس بات کا اعتراف موجود نہیں ہے کہ صرف ذوالریاستین کا قتل اہلِ بغداد کی شکایت دور کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ اس لئے کہ اہلِ بغداد دو طبقات میں تقسیم تھے۔ ایک طبقہ عربوں پر مشتمل تھا جو ذوالریاستین (فضل بن سہل) سے ناراض تھا اور دوسرا طبقہ جو عباسیوں پر مشتمل تھا۔ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے سبب ناراض تھا۔ ظاہر ہے صرف ذوالریاستین کے قتل کی خبر سے دونوں طبقے یعنی کل اہلِ بغداد خوش نہیں ہو سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ مامون نے صرف اس ایک قتل پر اہلِ بغداد کو کوئی خط نہیں لکھا وہ اس کے لئے دوسرے قتل کا بے چینی سے منتظر تھا۔ یہ دوسرا قتل پہلے قتل سے ساتویں مہینے میں واقع ہوا جس کے فوراً بعد مامون نے یہ خط تمام اہلِ بغداد کے نام لکھا۔ اس سے یہ راز بھی فاش ہو جاتا ہے کہ مامون نے ان دونوں کو قتل کرنے کا منصوبہ ایک ساتھ بنایا تھا اور یہ منصوبہ اس وقت بنا لیا تھا جب وہ سفر پر روانہ ہوا تھا اور اس نے امام رضاؑ سے یہ بات کہی تھی کہ "میں بے خبر نہیں ہوں بلکہ مناسب تدبیر کی فکر میں ہوں۔" (ہم اس طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں) پہلے قتل پر خاموش رہنا اور دوسرا قتل ہوتے ہی خط بھیجنا دونوں قتل دورانِ سفر ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ خط کا بھیجنا بھی اس منصوبے میں شامل تھا نیز یہ کہ جس طرح ذوالریاستین کا قتل مامون کے حکم سے ہوا اسی طرح امام علی رضاؑ کو بھی زہر مامون کے منصوبے کے مطابق اس کے ایما سے دیا گیا اور جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے وہ اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے ہی اپنے سفر کو دورہ کے "بہانے" سے طول دے رہا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پہلے اس نے خط بھیج کر اہلِ بغداد کی اپنے حق میں رائے معلوم کرنا چاہی لیکن جب اُسے اُن کی جانب سے خلافِ توقع سخت جواب ملا تو اس نے بغداد میں داخلہ کو مزید ایک سال التوا میں رکھا اور پل پل کی خبریں منگوا تا رہا۔ جب بغداد کے دونوں طبقے مطمئن ہو گئے تو مامون بڑے کروفر سے بغداد میں داخل ہوا تمام اہلِ بغداد نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اسے یہ کہنے کا موقع ملا کہ "تمام ممالک اسلامیہ پہ عباسی حکومت ہے۔"

اگر امام کی ولی عہدی سے حکومتِ عباسیہ کو خطرہ نہ ہوتا تو جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے مامون آپؑ کی وفات کے بعد آپؑ کے فرزند حضرت محمد تقی الجوادؑ کی ولی عہدی کا اعلان کرتا۔

حضرت علامہ شبلی نے یہاں بھی مامون کے اہلِ مت کے ساتھ دلی خلوص کو اس کی صفائی میں پیش

کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا" اس سے شیعہ بھی انکار نہیں کرتے فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ اسے فریب کارانہ خلوص کا نام دیتے ہیں چونکہ خود مامون کے آئندہ احکامات واقدامات ثابت کر دیتے ہیں اس لئے شیعہ اسے دھوکہ و فریب کا نام دیتے ہیں۔ سادات کے ساتھ، حضرت علی رضاؑ کی وفات کے بعد، جو طریق عمل مامون کا رہا حضرتؑ کی وفات سے پہلے یا بعد اس کی ترتیب سے ظاہر ہونے والے نتائج کو علامہ شبلی، مامون پر غلط اتہام کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حضرت امام علی رضاؑ کی وفات کے فوراً بعد مامون نے اہل بغداد کو مسرت و اطمینان سے بھرا خط لکھا اور اس کے ذریعہ اُن سے خوشی و رضامندی کا طلب گار ہوا۔ حضرت امام کی زندگی میں سادات کے جس مخصوص سبز رنگ کو اس نے حکماً رائج کر دیا تھا۔ حضرتؑ کی وفات کے بعد بغداد میں داخل ہوتے ہی اُس نے خود عباسیوں کا مخصوص سیاہ لباس منگا کر پہنا درباریوں کو سیاہ رنگ کی خلعتیں عطا کیں اور پہلا حکم منسوخ کر دیا۔ اس نے متعہ کے جائز ہونے کا حکم بھی واپس لے لیا تھا۔ وہ حضرت علیؑ کی فضیلت کا قائل تھا لیکن بعد میں دیگر صحابہ کی فضیلت کا اقرار بھی کرنے لگا تھا پھر اُس نے بتدریج سادات اور علویوں کی دی گئی مراعات ختم کر دیں ان سے عہدے واپس لے لئے حتیٰ کہ دربار میں ان کا داخلہ کلیتاً بند کر دیا تھا۔ حضرت امام کی وفات کے بعد مامون میں پیدا ہونے والی یہ تبدیلیاں وفات سے قبل کے تمام حالات کی تردید کر رہی ہیں اور اس سے شیعوں کا یہ فیصلہ زیادہ قابلِ یقین معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مامون کا فریب تھا وہ حضرت امامؑ کی ولی عہدی کے اعلان سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جو اسے عباسیوں نے نہیں اُٹھانے دیا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ علامہ شبلی نے ان حالات کی ترتیب اور نتائج سے کیونکر یہ نتیجہ نکالا کہ "یہ مامون پر غلط اتہام ہے" جبکہ یہ سب واقعات تمام مورخین کے ساتھ خود علامہ شبلی نعمانی نے بھی لکھے اور تسلیم کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"نہروان میں آٹھ دن قیام کر کے مامون بغداد کو چلا اور ۱۵ صفر ۲۰۴ھ کو بڑی شان و شوکت سے دارالخلافہ میں داخل ہوا ۔۔۔ اس نے خود دربار میں سیاہ لباس منگا کر پہنا۔ طاہر اور تمام افسران فوج کو سیاہ رنگ کے خلعت مرحمت کئے ۔ ۲۰ صفر ۲۰۴ھ کو کامل ۲۱ لغایۃ ۱۰۱ بھی یہی تھے (المامون صفحہ ۸۸

لباس چھوڑ کر سیاہ لباس اختیار کریں اور آج سے دربار میں نہ آنے پائیں

(المامون ص۹۱)

وہ (مامون) حضرت علی کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتا تھا۔ لیکن (بعد میں)

اور خلفاء سے بھی بد اعتقاد نہ تھا۔ اس نے ایک نظم میں حضرت عثمان و عائشہ

کی نسبت بھی اپنا راسخ اعتقاد ظاہر کیا ہے (المامون ص۲۰۸)

علامہ شبلی مرحوم کی اپنی تحقیقی و تاریخی کتاب "المامون" میں جا بجا ان کے یہ اور اس جیسے دوسرے بیانات امام علی رضاؑ کی وفات کے بعد مامون میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں اور اس تبدیلی سے آپؑ کی وفات سے پہلے کے اس کے افعال و کردار کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ یہی حقائق حضرت امام کی وفات سے قبل مامون کے کردار کو فریب ثابت کرتے ہیں۔ اور آپ کی وفات کے بعد مامون کے افعال، اس کے فریب کا پردہ چاک کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

علامہ شبلی کے بیان کا یہ آخری طویل جملہ "بے شبہ مامون کے خاندان والے حضرت علی رضاؑ کی ولیعہدی سے ناراض تھے انہیں میں سے کسی نے یہ بیہودہ حرکت کی ہوگی" اصل ملزم سے توجہ ہٹا کر کسی بھی نامعلوم و موہوم ملزم کی تلاش میں سرگردانی کے لئے کافی ہے۔ نہ ملزم ملے گا نہ قتل ثابت ہوگا۔

حیرت کی بات ہے کہ علامہ شبلی اس بارے میں اہل سنت کے تمام مورخوں سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں درحقیقت اکثر مورخین نے مامون پر لگائے گئے الزامات کو صاف الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے ان میں فضل اور طاہر کا قتل سرفہرست ہے۔ قتل کے ان دونوں واقعات میں تاریخی ثبوت اور گواہوں کے ہوتے ہوئے بھی علامہ موصوف قتل کے حکم کو براہ راست مامون کی ذات سے لازم نہیں گردانتے اور جب ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد بطور مجبوری فضل کے قتل میں مامون کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں تو اس اقرار کیلئے وہ ایک انتہائی غیر معمولی طرز تکلم اپناتے ہوئے قتل کا جواز بھی تلاش کر لیتے ہیں یعنی ان کی نظر میں فضل کے قتل کا حکم در پردہ مامون نے نہیں دیا بلکہ قاتلوں نے مامون کی موجودگی میں مامون پر غلط الزام عائد کیا حالانکہ یہ ایک نہیں چار گواہ تھے اور چاروں کا بیان بلا اختلاف یہ تھا کہ ہمیں اس قتل کا حکم امیر المومنین مامون نے دیا تھا۔ دوسری طرف اگر بحالت مجبوری کوئی راز نہ کھلنے

ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے کہ حکم مامون نے دیا تھا تو ان کی نگاہ میں اس کا یہ اقدام ناجائز نہیں تھا کیونکہ وہ مجبور تھا اور اس قتل کے بغیر کوئی چارہ کار اس کے پاس تھا ہی نہیں (بہت خوب)

یہی طرز بیان صفائی علامہ موصوف نے طاہر کے قتل سے متعلق کیا ہے۔ تمام مورخین اور خود علامہ شبلی نے صاف الفاظ میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ مامون طاہر کی پر خلوص خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی قوت اور صلاحیت سے خوفزدہ تھا جب طاہر خراسان روانہ ہونے سے پہلے مامون سے رخصت ہونے آیا تو مامون نے پہلے سے تیار کئے ہوئے منصوبہ کے تحت اسے ایک غلام اس کی خدمت کے صلہ میں تحفتاً پیش کیا۔ لیکن دراصل یہ مامون کا جاسوس تھا اور اسے یہ حکم مامون دے چکا تھا کہ جب بھی طاہر میں بغاوت کے آثار دیکھے تو اسے فی الفور زہر دے کر ختم کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ علامہ صاحب مامون کے ہاتھوں طاہر کے قتل کا انکار تو نہ کر سکے لیکن مامون کی طرف سے صفائی پیش کرنے، مامون کے اس عمل کو جائز قرار دینے اور طاہر کے قتل میں شبہات پیدا کرنے سے بھی وہ نہیں چوکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحقیق اور رائے کو یوں بیان کیا ہے۔

"طاہر کو جمعہ کے دن بخار چڑھا ہفتہ کی صبح کو لوگ عیادت کیلئے گئے تو دربانوں سے معلوم ہوا کہ آج خلاف معمول ابھی تک خوابگاہ میں ہے زیادہ دیر ہوئی تو لوگ اندر گئے۔ طاہر سر سے پاؤں تک کپڑے میں لپٹا ہوا مردہ پڑا تھا (اسی کے ساتھ وہ اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں) بعضوں کا بیان ہے کہ پلکوں میں کچھ عارضہ پیدا ہوا جس سے وہ دفعتاً گر پڑا اور مر گیا۔ (المامون ص ۹۲)

بڑے صاف الفاظ میں، مامون کے ایماء پر طاہر کو زہر دیئے جانے کا اقرار کرنے کے باوجود وہ قتل کے عمل میں شکوک پیدا کرتے ہیں، اور پھر مامون کے اس جرم کو ہلکا کرنے کے لئے اسکے اس اقدام کو سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا فرض قرار دیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے مامون کے ایما پر کئے جانے والے اس قتل کا جواز پیدا کیا ہے۔

ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا لیکن اگر مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا؟

لیکن مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا ضروری فرض تھا۔ تاہم اس (طاہر) کے خاندان سے کچھ تعرض نہ کیا بلکہ اس کی اولاد کو اس مرتبہ پر پہنچایا کہ کچھ زمانہ کے بعد خراسان میں ان کی مستقل حکومت قائم ہوگئی۔ (المامون صـ۹۳)

جب اہلسنت کے محقق مورخین کا یہ رویہ ہو کہ وہ مامون کو کھلا مجرم تسلیم کر لینے کے بعد بھی اس کے حق میں صفائی، عذر، معذوری، مجبوری، جواز اور بچاؤ پیش کرنے سے گریز پر کسی طور آمادہ نہ ہوں تو ان سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت کی سازش کو تسلیم کر لینے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ مامون کے حکم سے امام کو زہر دینے کو تسلیم کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔

ہم یہاں، مبصرین کی نظروں سے اوجھل ایک اور گوشہ کی طرف توجہ دلانا ضروری اور مناسب خیال کرتے ہیں۔ مطلق العنان کی عالمی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی بھی خطے کے حکمران خواہ وہ قبل تاریخ سے تعلق رکھتے ہوں یا زمانہ بعد از تاریخ سے، خواہ وہ مصر کے فراعنہ و خدیو ہوں یا روس کے زار، وہ خواہ روم کے قیاصرہ ہوں یا یونان کے حکمران وہ ایران کے ہخامنشی، یا اکاسرہ ہوں یا عرب کے خلیفہ اور حبش کے نجاشی وہ ہند کے آریائی بادشاہ و خود مختار راجہ ہوں یا سندھ کے باختیار کلہوڑہ غرض حکمران شرقی ہو یا غربی اس نے جب کسی درباری عہدہ دار، حکومت کے تنخواہ دار یا رعایا میں سے کسی فرد کو حکم عدولی، قانون کی خلاف ورزی یا جرم و بغاوت کرتے پایا اس پر فرد جرم عائد کر کے برسر عام قتل یا پھانسی کا حکم دیدیا۔ آخر مجرم کا جرم اور اس مجرم کی حکمران کی جانب سے دی گئی سزا کو چھپانے اور مجرم کی موت کو حادثہ قرار دینے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ تمام بادشاہوں نے مجرموں کو مجمع عام کے سامنے سزائیں دیں ان میں موت کی سزائیں بھی شامل ہیں تاریخ نے ان واقعات کو بلا کم و کاست قلمبند کیا اور بغیر کسی شک و شبہ کے اگلی نسل تک پہنچا دیا اب یہ کام اپنے وقت کے قارئین، محققین اور مبصرین کا ہے کہ وہ ان سزاؤں اور ان حکمرانوں کو حکمرانی کی تاریخ میں کیا درجہ دیتے ہیں آیا وہ انہیں عدل گستر، منصف طبع، انصاف پسند، رحمدل اور عادل قرار دیتے ہیں یا تنگ نظر، سفاک اور قاتل تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی مستند مثالیں موجود پائی

جاتی ہیں جیسے نوشیرواں اور جہانگیر عدل میں تاریخی شہرت کے حامل ہیں جبکہ خلیفہ عبداللہ السفاح اور ہلاکو تاریخی طور پر ظالم و خونخوار مشہور ہیں اور یہ فیصلہ عالمی تاریخ کا ہے نہ کہ کسی فرقہ یا جماعت کا یا کسی ہیرو پسند، جانبدار مورخ کا۔

اسلام ایک فطری مذہب جس کا اولین بنیادی مقصد انسانی سماج میں فطرتِ الٰہیہ اور نہ تبدیل ہونے والے عدل و قسط پر مبنی قوانین کو رواج دینا تھا نہ کہ خلافت کے پردہ میں ملوکیتیں قائم کرنا بہر حال جب سے اسلامی مملکتیں قائم ہوئیں ان بادشاہوں اور خلیفوں نے خواہ وہ بنوامیہ کے معاویہ، یزید اور عبدالملک بن مروان وغیرہ ہوں یا بنو عباسیہ کے خلفاء عبداللہ سفاح و ابوجعفر منصور یا مہدی و ہارون ہوں ان لوگوں نے مجرموں کی سزا کے لئے، عدالت عام کی جگہ خفیہ طریقے نئے واردات ایجاد کر لئے تھے اور اس مقصد کیلئے خونخوار و خونریز ظالم، زیاد بن سمیہ، عبداللہ بن زیاد، مسلم بن عقبہ اور حجاج بن یوسف جیسے عامل و فوجی ملازم اور خفیہ قتل کی واردات کیلئے فرج دیلمی، موفق جیسے اجرتی قاتل رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان قاتلوں کو حکم دے کر اپنے حریفوں کو قتل کراتے پھر ان قاتلوں کو قتل کے جرم میں بر سرِ عام قتل کرا دیتے یوں قتل کی سازش ہمیشہ کے لئے عوام کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ جاتی اگر یہ قاتل بے خوف ہو کر خلیفہ کا نام لیتے کہ قتل کا حکم ہم کو خلیفہ نے دیا تھا تو اُسے شک و شبہ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ ایسے خطرناک تجربات کے بعد ان بس پردہ قاتل خلیفوں نے زہر کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا تھا۔ زہر جس سے قتل کے نشان ظاہر نہیں ہو پاتے تھے اور قتل کا سُراغ کبھی نہ ملتا تھا۔ مقتول کو کسی خفیہ و پیچیدہ قدیم بیماری کا شکار ظاہر کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت امام علی رضاؑ سے متعلق ہیضہ کی شکایت کا ذکر کیا گیا ہے جس کا اظہار پہلی مرتبہ ابنِ خلدون نے کیا تھا۔ اس مقصد کیلئے صرف اجرتی قاتل اور زہر ہی کو ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں جنات کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔ انصار کے قبیلہ خزرج کے سردار اور صحابیٔ رسولؐ حضرت سعد بن عبادہ کو جنات ہی کے ذریعہ قتل کرایا گیا تھا۔ انصار مدینہ نے سعد بن عبادہ کو خلیفۃ الرسولؐ منتخب کیا تھا لیکن جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہو گئے تو ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے نہ تو زندگی بھر ان کے پیچھے نماز پڑھی اور نہ ہی انکی بیعت کی پھر حضرت عمر کی بیعت بھی نہیں کی اور اس خیال سے کہ بیعت پر اصرار نہ کیا جائے آپ مدینہ چھوڑ کر شام کے ایک گاؤں میں چلے گئے۔ تاریخ صرف اتنا بتاتی ہے کہ وہ ایک رات سوئے اور صبح کو

اپنے بستر پر قتل پائے گئے لوگوں کا کہنا تھا کہ انہیں جن قتل کر گئے۔ ڈاکٹر طٰہٰ مصری نے بھی تاریخ کے حوالے سے اسی قدر ذکر کیا ہے لیکن وہ اس سے آگے کی بات طنزیہ طور پر ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اور وہ جن شعر بھی پڑھتے تھے" جن کا مطلب یہ تھا کہ سعد کو ہم نے قتل کیا ہے ــــ جاہل عرب بدروحوں اور جنات کے ایسے افعال پر یقین رکھتے تھے لہٰذا نہ جن پکڑے گئے اور نہ اس سازش کا راز فاش ہوا۔ بعض بصریین نے اس واقعہ پر شبہ اور سازش کا اظہار کیا ہے۔ دراصل جس طرح زہر خورانی اور اس کی دریافت کا پہلا تجربہ معاویہ بن ابو سفیان سے منسوب ہے اسی طرح جنات کی دریافت اور ان کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کا تجربہ بھی معاویہ حاکم شام کی ذات سے منسوب ہے۔ سعد بن عبادہ کو معاویہ بن ابی سفیان نے قتل کرایا اور یہ مشہور کر دیا کہ انہیں جن قتل کر گئے ہیں۔

اس مختصر تفصیل کے ذریعہ ہمارا مقصود صرف اس جانب توجہ مبذول کرانا ہے کہ آخر یہ با اختیار خلیفہ ان بے گناہ لوگوں کے ساتھ ایسا طریقہ کیوں اختیار کرتے تھے؟ یہ خلیفہ جن کے ساتھ سفر و حضر میں جلاد اور جمع رہتے ہوں اور ان کے ایک اشارۂ ابرو پر لوگوں کے سر تن سے جدا کر دیئے جاتے ہوں اور کوئی باز پرس کرنے والا بھی نہ ہو آخر یہ امر مطلق خلیفہ بعض اوقات اس قدر گھناؤنے طرز عمل کو اپنانے پر کیوں مجبور ہو جاتے تھے؟ ــــ ظاہر ہے ایسے افراد کا کوئی گناہ اتنا بڑا نہیں ہوتا تھا جس کی پاداش میں انہیں قتل کر کے اپنی راہ صاف کر لی جائے یہ خلیفہ ان کی طاقت، عوام میں ان کا اثر و رسوخ اور مقبولیت سے خوفزدہ رہتے تھے وہ ان کو اپنی خلافت کے لئے اور عوام میں اپنی مقبولیت کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس لئے اجرتی قاتل، سم قاتل اور قاتل جنات کے ذریعہ وہ انہیں قتل تک پہنچاتے اور خود قتل کے الزام سے پاک، قصاص سے بری اور تاریخ میں بدنام قاتل ہونے سے محفوظ رہتے۔ ابو مسلم خراسانی، خاندان برامکہ، فضل بن سہل، طاہر اور حضرت امام علی رضا کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے قاتل ثابت ہو جانے پر بھی انہیں قاتل کوئی نہیں کہتا اگر اس کا ذکر ہو تو شکوک و شبہات بھی مذکور ہوتے ہیں اور ان ہی قاتلوں کو دور و دہشت میں یگانہ، انصاف و عدل میں فرزانہ اور رحم و درگزر میں بے مثل زمانہ کہا جاتا ہے شاید اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے خلیفہ بھی اور ان کے پسندیدہ ہیرو بھی۔

ان تاریخی حقائق کی روشنی میں مامون ہی کو لیجئے۔ مامون ایک وسیع و عریض اسلامی مملکت کا با اختیار خلیفہ تھا۔ اگر فضل سے ایسی غلطی سرزد ہوئی تھی جو ناقابلِ معافی اور سزا کے لائق تھی تو اسے گرفتار کر کے پابزنجیر حاضر کرنے کا حکم دیتا دربارِ عام میں اس کے جرم کی صفائی طلب کرتا اگر اس کی سزا قتل ہوتی تو قتل کا حکم دیتا کون تھا جو اُسے روکتا یا برا کہتا۔ اگر کوئی ایسا گناہ نہ تھا تو اسے قید کر دیتا لیکن اس نے اجرتی قاتلوں کو حکم دے کر اسے حمام میں قتل کرا دیا۔ صرف عربوں کو خوش کرنے کے لئے۔ اسی طرح اگر طاہر کی طرف سے بغاوت کا خطرہ تھا اور واقعی اس نے بغاوت کی تھی تو بغاوت کی سزا ہر دور میں قتل رہی ہے وہ اسے بغاوت کا جرم ثابت کر کے قتل کا حکم دے سکتا تھا لیکن اس نے تحفہ میں پیش کردہ غلام کے ذریعہ اسے زہر دلایا اور اپنی خلافت کی راہ سے دور کر دیا۔ اب اگر مامون مختار حاکم ہوتے ہوئے سزا کا اختیار رکھتے ہوئے اور قتل کا جواز مہیا کرنے میں مہارت کے باوجود وہ خلافت کے ملازمین کے اثر و رسوخ سے اتنا خوفزدہ ہو کہ سزا کا حکم نہ دے سکے اور سازش کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے اور خود کو عوام کے طعن اور تاریخ میں بدنامی سے بچانے کے لئے یہ راستہ اختیار کرے تو حضرت امام علی رضاؑ جو نہ تو دربار کے عہدہ دار تھے نہ خلافت کے تنخواہ دار، نہ وہ باغی تھے اور نہ ان پر بغاوت کا شبہ تھا جو عوام میں مقبول تھے اور عقیدت مندوں کے امام، دنیاداری سے دُور گوشہ نشین۔ جن کے قتل کا نہ جواز موجود ہو اور نہ ہی پیدا کرنے کا کوئی امکان۔ پھر مامون بظاہر آپ کی عزت و توقیر میں پیش پیش بھی ہو تو کیا وہ آپ کی ولی عہدی کے خطرہ کو دور کرنے اور عباسیوں کو خوش کرنے کے لئے زہر کے خفیہ ہتھیار کو استعمال کرنے پر مجبور نہیں ہوگا؟ اور کیا وہ اس اقدام سے گریز کرنے پر ایک لمحہ کیلئے بھی غور کرے گا؟ —— ہرگز نہیں۔

اب ہم آخر میں حضرت علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا وہ بیان پیش کرنا ضروری خیال کریں گے جس میں انہوں نے مامون کی برئیت پر کئی جگہ زور دینے کے باوجود ہر طرف سے مایوس ہو کر کھلے الفاظ میں مامون کو فضل کا قاتل تسلیم کر لیا ہے۔ وجہ قتل کی یکسانیت کے سبب گویا غیر شعوری طور پر وہ حضرت امام کا قاتل بھی مامون ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ صحیح کہا گیا ہے کہ حق چھپائے نہیں چھپتا وہ کسی نہ کسی طرح خود کو ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعی حق کو چھپانے کی بات کرتا ہے لیکن

حق اپنی الفاظ سے اپنا اظہار پالیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم اپنے کسی فعل کا اظہار کر رہا ہوتا ہے اور اسی سے اس کے کسی دوسرے جرم کا اقرار ظاہر ہو جاتا ہے۔ علامہ شبلی اپنے اس بیان میں شعوری طور پر فضل کے قتل کا مجرم مامون کو ٹھہراتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ لاشعوری طور پر حضرت امام کے قتل کا مجرم بھی مامون ہی کو ٹھہرائے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ المامون کے صد ۱۵۲ پر لکھتے ہیں۔

"شاید ایک معترض نہایت آسانی سے مامون پر یہ الزام لگائے کہ ذوالریاستین جس نے مامون کی بنیاد حکومت کو گرتے گرتے سنبھال لیا خود مامون کے اشارے سے قتل کر دیا گیا۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آخر علاج کیا تھا؟ نہ ذوالریاستین اپنی خودسری سے باز آسکتا تھا نہ اہل عرب اس کے سامنے سر جھکا سکتے تھے۔ موقع ایسا آپڑا تھا کہ بقائے خلافت اور ذوالریاستین کا اجتماع ناممکن ہو گیا تھا۔ مامون نے بے شبہ ذوالریاستین کو خلافت کی نذر کر دیا اب اگر یہ الزام کی بات ہے تو ہو۔ ہم مامون کو اس سے نہیں بچا سکتے ہاں اس کا جواب ہمارے پاس یہ بھی نہیں کہ ذوالریاستین کے قاتلوں کو اس نے کیوں قتل کرا دیا۔ شاید پالیسی کے وسیع قانون میں یہ باتیں جائز رکھی ہوں؟

اس بیان میں علامہ شبلی نے مان لیا ہے کہ ذوالریاستین یعنی فضل بن سہل کا قتل مامون ہی کے حکم سے ہوا تھا اور اس نے اپنی خلافت بچانے کے لئے فضل کو خلافت پر قربان کر دیا تھا۔ علامہ نے قتل کی جو بنیادی وجہ یعنی "بقائے خلافت اور ذوالریاستین کے اجتماع کا ناممکن ہونا بیان کیا ہے بالکل وہی وجہ حضرت امام کے قتل میں موجود ہے اور وہی طریقۂ واردات یوں فضل کے حق میں علامہ کا یہ اقرار حضرت امام کے حق میں بھی اقرار کی شکل قرار پاتا ہے۔ علامہ ہی کے الفاظ میں یہ اقرار یوں ترتیب پاتا ہے۔

"شاید ایک معترض نہایت آسانی سے مامون پر یہ الزام لگائے کہ حضرت علی رضا جن کی ولی عہدی نے مامون کی بنیاد حکومت کو گرتے گرتے سنبھال لیا خود مامون کے اشارے سے قتل کئے گئے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آخر علاج کیا تھا؟ نہ حضرت امام کی ولی عہدی ختم ہو سکتی تھی اور نہ عباسی ان کے سامنے

سر جھکا سکتے تھے۔ موقع ایسا آپڑا تھا کہ بقائے خلافت اور ولی عہدی امام کا اجتماع ناممکن ہو گیا تھا۔ مامون نے بے شبہ امام کو خلافت کی نذر کر دیا اب اگر یہ الزام کی بات ہے تو ہم ہم مامون کو اس سے نہیں بچا سکتے۔ ہاں اس کا جواب ہمارے پاس بھی نہیں کہ امام علی رضاؑ کے قاتلوں کو اس نے گرفتار کیوں نہیں کیا؟ شاید پالیسی کے اس قانون میں یہ باتیں جائز رکھی گئی ہوں؟

تمام مطلق العنان بادشاہ بالخصوص بنو امیہ اور بنو عباس کے خلیفہ اس شخص کو کسی نہ کسی طرح قتل کرا دیا کرتے تھے جس سے انکی خلافت کے لئے خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید قیصر روم کے اس خط سے ہوتی ہے جس کا مفہوم خود خلیفہ عبدالملک نے بیان کیا تھا ـــــ کہتے ہیں خلیفہ عبدالملک نے امام شعبی کو قیصر روم کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ جب امام شعبی روم سے واپس ہونے لگے تو قیصر روم نے خلیفہ کے نام چند خطوط دیئے اور ایک سربمہر لفافہ علیحدہ دیکر کہا کہ یہ خط سب کے بعد خلیفہ کو دینا۔ امام شعبی نے جب وہ لفافہ سب سے آخر میں دیا اور خلیفہ نے اسے پڑھا تو امام شعبی کی طرف دیکھا اور پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے اس خط میں کیا لکھا ہے؟ امام نے کہا مجھے علم نہیں ہے خلیفہ نے خط امام کی طرف بڑھا دیا، اس میں لکھا تھا "مجھے اس قوم پر حیرت ہے جس نے شعبی جیسے انسان کو چھوڑ کر ایک دوسرے شخص کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے" خلیفہ نے پوچھا کیا آپ اس مضمون کا مقصد سمجھ گئے ہیں؟ امام شعبی نے جواب دیا۔ "نہیں امیر المومنین" خلیفہ نے کہا۔ قیصر نے یہ خط اس لئے لکھا ہے کہ وہ آپ جیسی شخصیت کو ہمارے درمیان دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ہم آپ سے بدظن ہو جائیں اور آپ کو اپنے لئے خطرہ جان کر آپ کو قتل کرا دیں"

علامہ معاصر "زہر خوارگی کا اصل واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک روز مامون نے امام رضاؑ کو گلے سے لگایا اور پاس بٹھا کر ان کی خدمت میں انگوروں کا ایک طبق پیش کیا اور اس میں سے ایک خوشہ اٹھا کر آپ سے کہا ابن رسول اللہ! یہ انگور نہایت عمدہ ہیں۔ تناول فرمایئے۔ آپؑ نے یہ کہتے ہوئے انکار کیا کہ جنت کے انگور ان سے بہتر ہیں۔ جب اس نے شدید اصرار کیا تو آپ نے ان میں سے تین دانے کھا لئے یہ انگور زہر آلود تھے۔ انگور کھانے کے بعد آپؑ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا "جہاں تو بھیجنا چاہتا ہے" قیام گاہ

پر بجا کر آپ تین روز تک کرب کی حالت میں رہے۔ بالآخر انتقال فرمایا۔

ابا الصلت ہروی نے بقول علامہ عبدالرحمن جامی، اسی واقعہ کو بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ایک روز امام رضاؑ نے مجھ سے ہارون کی قبر کی پائنتی کی مٹی منگوائی۔ پھر سرہانے کی مٹی منگوائی اور اسے سونگھ کر کہا کہ "اسی مقام پر میری قبر ہوگی۔ (چودہ ستارے)

حضرت امام کی شخصیت و کردار

"اعیان الشیعہ" ایک ایسی کتاب ہے جس میں اہلِ تشیع کے تمام اکابر و ائمہ کے علم و فضل، اخلاق و عادات، شخصیت و کردار، افعال و اعمال اور معمولات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں آپ کے فضائل کا ذکر تفصیل سے موجود ہے اور بتلایا ہے کہ آپؑ جب اپنے روزانہ امور سے فارغ ہو جاتے اور دسترخوان بچھایا جاتا تو آپؑ اسی دسترخوان پر اپنے غلاموں کو بھی بیٹھنے کا حکم دیتے تھے اور اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتے تھے۔ ایک روز تنگ آکر ایک بلخی ملازم نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا اگر ملازمین کے کھانے کا انتظام الگ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ آپؑ نے اس مشورہ کو پسند نہیں کیا اور اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پیدائشی طور پر سب انسان برابر ہیں۔ سب آدم و حوا سے پیدا ہوئے ہیں اور سب کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔

آپ موسم گرما میں بوریے پر بسر کرتے اور سرما میں ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ تنہائی کے علاوہ کسی کی موجودگی میں نہ آپ پاؤں پھیلاتے اور نہ تکیہ لگا کر بیٹھتے۔

ہر طبقہ کے افراد سے حسن سلوک کرتے کھانا کھانے سے پہلے غربا و مساکین میں کھانا تقسیم فرماتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ "خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے جو شخص غلام آزاد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بھی اس کیلئے جنت کا راستہ کھلا ہے اور جو اس راہ سے بہشت میں جانا چاہے وہ بندہ کو آزاد کرنے کے مقابل غریبوں کو کھانا کھلائے۔

یعقوب بن اسحاق کا کہنا ہے کہ "ایک شخص حضرت امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ "حضرت اپنی مروت کے مطابق کچھ عطا فرمایئے۔ آپؑ نے فرمایا ایسا نہ کہو۔ تب اس نے کہا اچھا میری مروت کے مطابق عطا فرما دیجئے۔ آپ نے دو سو درہم اسے دیدیئے۔ "مناقب"

میں لکھا ہے کہ آپ نے خراسان میں قیام کے دوران، عرفہ کے دن اپنا تمام مال لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا
رات کو کم سوتے تھے دن کو روزہ رکھتے تھے۔ ہر ماہ تین روزے معمولات سے تھے۔ آپ کہا
کرتے تھے کہ یہ روزے اخلاط میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ آپ غلاموں اور کنیزوں سے بھی نرمی سے
بات کرتے۔ کبھی کسی کو غلطی پر نہ جھڑکتے تھے۔ کسی کے کلام کو قطع نہ کرتے تھے۔ کسی کا سوال رد
نہ فرماتے۔ آپ کبھی نہ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے اسے برا جانتے۔ ایسے موقع پر آپ صرف مسکرا دیا
کرتے تھے۔ برائیوں سے روکتے تھے اور نیکیوں کی تلقین کرتے تھے۔

بہت سادہ لباس پہنتے اس ضمن میں آپ نے وہی طرز اختیار کی تھی جو آپؑ کے جد حضرت علیؑ
کی تھی۔ لیکن جب کبھی آپ کو مجلس عام میں جانا ہوتا تو مناسب حال لباس زیب تن فرماتے۔ یہ صرف
اس لئے تھا کہ لوگ طعن کا نشانہ نہ بنائیں اور اسے دکھاوے سے تعبیر نہ کریں۔ چنانچہ ایک روز کسی شخص
نے کہہ دیا کہ آپ اتنا اچھا لباس پہنتے ہیں تو آپؑ نے اپنا دامن اٹھا دیا اور کہا یہ ہے میرا لباس۔ اوپر
کا لباس عوام کو دکھانے کیلئے ہے کہیں وہ ریاکار نہ سمجھ بیٹھیں۔

علم و فرمان

مامون اکثر آپ سے ہر موضوع پر سوال کر کے آپ کو آزماتا تھا۔ احیاء الشیعہ
میں لکھا ہے کہ آپ اس کے تمام سوالوں کا جواب قرآن حکیم کے حوالے سے دیا کرتے
تھے اور کوئی سوال ایسا نہیں تھا جس کے متعلق آپ نہ جانتے ہوں یا جواب سے عاجز رہے ہوں۔

امام علی رضاؑ سے مامون کا سوال

"عیون الاخبار" میں ابو الصلت الہروی سے منقول
ہے " وہ کہتا ہے خلیفہ مامون نے امام علی رضا ابن موسیٰ
کاظم علیہم السلام سے پوچھا بتاؤ تمہارے جد امجد امیر المومنین علی ابن ابی طالب کس طرح قسیم النار
والجنۃ ہیں؟ جناب امام رضا نے جواب دیا کہ "کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے آباؤ اجداد نے عبداللہ بن
عباس سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو کہتے سنا ہے "حب علیؑ ایمان ہے
اور بغض علی کفر ہے"۔ مامون نے جواب میں کہا "ہاں سنا ہے"۔ امام نے فرمایا "جنت مومن کیلئے ہے
اور دوزخ کافر کے لئے۔ پس جب جنت اور دوزخ کی تقسیم علیؑ کی محبت اور عداوت کی بنا پر ہو گئی
تو علی قسیم النار والجنۃ ہوئے۔

مامون اس جواب پر پھڑک اٹھا اور کہا کہ خدا مجھے آپ کے بعد باقی نہ رکھے۔ آپ واقعی اپنے

جد رسول اللہ کے وارث ہیں۔

ابو الصلت کہتا ہے، جب میں امام رضا کے دولت کدہ پر آیا تو میں نے ان سے کہا۔ میں آپ پر فدا ہوں۔ یابن رسول اللہ آپ نے مامون کو خوب جواب دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ابو الصلت یہ جواب تو اس کے موافق تھا۔ ورنہ میں نے اپنے والد بزرگوار کو اپنے آباؤ اجداد سے حضرت علیؑ کی یہ روایت بیان کرتے سنا ہے کہ فرمایا جناب رسول خدا نے کہ "اے علی! تم قسیم النار والجنۃ ہو۔ تم قیامت کے دن جہنم سے کہو گے کہ یہ شخص تیرے لئے ہے اور وہ میرے لئے (البلاغ المبین ص ۳۰۸)

یہی حدیث جواہر العقدین میں حافظ جمال الدین الزرندی نے بیان کی ہے اور امام اہلسنت حضرت شافعی علیہ الرحمتہ نے حدیث صحیحہ کی روشنی میں یہ اشعار کہے ہیں۔

علیؑ حبہ جنۃ، قسیم النار والجنۃ وصی المصطفیٰ حقہ، امام الانس والجنۃ

آپ کے والد ماجد حضرت امام موسیٰ کاظم فرمایا کرتے تھے: "یہ علی بن موسیٰ "عالم" آلِ محمد" ہیں۔ تم اپنے عقائد کے متعلق ان سے پوچھا کرو اور وہ جو کچھ کہیں اسے یاد کر لیا کرو"

آپ کے زمانہ کے مذہبی علماء مشکل مسائلِ دینی میں آپ ہی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ ایک راوی بیان کرتا ہے کہ تحریری طور پر جن مسائل کا جواب آپؑ نے دیا ہے۔ ان کی تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچتی ہے۔

مختلف قبائل واقوام کے اسلام قبول کرنے اور نبی اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد مسلمانوں میں سیاسی الجھنوں سے دین میں فکری اختلاف کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو ملوکیت نے نئے نظریے پیش کئے تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکیں۔ غرض اس سے فکری بحث کا آغاز ہوا اور اسلام میں نئے فرقوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اور ان فرقوں نے باہم توحید، جزا و سزا اور قضا و قدر جیسے موضوعات کو اپنی بحث کا مرکز بنا لیا۔ حضرت امام علی رضاؑ کے زمانہ تک ایسے بے شمار مسائل نے لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا تھا۔ لوگ آپؑ سے اسی قسم کے اکثر سوالات کرتے تھے اور آپ اپنے تبحر علمی سے ان کے اطمینان بخش جوابات دیتے تھے۔ چنانچہ آپؑ نے صفاتِ باری تعالیٰ، وحدانیت، لطیف و خبیر، ظاہر و باطن، رسالت و امامت، علم و جہل، قائم، دائم، قدیم، قاہر، عصمت وغیرہ کے علاوہ بہت سی آیاتِ قرآنی کی تفسیر بیان فرمائی۔ بالخصوص آپ نے امام کے وجود

اور امام کی صفات و مدارج پر تفصیلی کلام فرمایا۔

علامہ شبلی حضرت امام علی رضاؑ کے علم و فضل سے متعلق لکھتے ہیں۔

نہایت بڑے عالم اور اتقیائے روزگار میں سے تھے۔ ابو نواس عرب کے مشہور شاعر سے لوگوں نے کہا۔ "تو نے ہر مضمون کے شعر لکھے اور حضرت علی رضاؑ جو فخر روزگار ہیں ان کی شان میں دو شعر بھی نہ کہے۔ اس نے جواب دیا۔ ان کا پایہ کمال میری مدح سے بہت اونچا ہے۔" (المامون صہ ۸۵)

"ایک بار عید کے دن مامون کے خوان کرم پر بہت سے مہمان جمع تھے تین سو سے زائد مختلف اقسام کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے۔ مامون ہر ایک کا خاصہ اور اثر بتا جاتا تھا کہ بلغمی مزاج کو یہ مفید ہے۔ سوداوی کو یہ نافع ہے جس کو صفرا کا زور ہو وہ اس خاص قسم سے پرہیز کرے جو ثقیل غذا کا عادی ہے وہ یہ کھائے۔ مامون کی ہمہ دانی پر تمام حاضرین محو حیرت تھے قاضی یحیٰی بن اکثم سے نہ رہا گیا بے ساختہ بول اٹھے کہ امیر المومنین آپ کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ طب کا ذکر ہو تو آپ جالینوس وقت ہیں۔ نجوم کی بات چھڑے تو ہرمس۔ فقہ کی بحث ہو تو علی مرتضیٰ سخاوت میں حاتم۔ راست بیانی میں ابوذر۔ اس سچی خوشامد سے مامون پھڑک اٹھا۔ اور کہا کہ ہاں آدمی کو جو شرف ہے عقل سے ہے ورنہ خون اور گوشت میں کیا خوبی رکھی ہے۔ (المامون)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ قاضی یحیٰی بن اکثم کی یہ خوشامد سچی تھی یا جھوٹی۔ لیکن کیونکہ مامون سے یہ کہے بغیر نہ رہا گیا کہ "آدمی کو جو شرف ہے وہ عقل سے ہے ورنہ خون اور گوشت کے مجموعہ انسان میں کوئی خوبی نہیں" اور اپنی اسی طبی علمیت کا رعب وہ عید کی اس دعوت میں حاضرین پر ڈالنا چاہتا تھا لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آخر مامون کو کھانے کے طبی خواص و اثر کا علم کیسے ہوا؟ بڑا اثر اور کارگر ضرور تھی جڑی بوٹیوں اور انسانی خوراک میں شامل ترکاریوں کے خواص و اثرات کا علم اسے کس نے دیا؟ شبلی مرحوم نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی حالانکہ وہ خود "المامون" کے صہ ۸۵ پر لکھتے ہیں کہ "حضرت امام علی رضاؑ نے طب میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا" یہی وہ رسالہ تھا جس کے مطالعہ سے مامون کے لئے

مامون نے طبی خواص کا علم حاصل کیا تھا۔ حضرت امام کو یہ عالمانہ صلاحیت ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے دادا حضرت امام جعفر صادق نباتاتی خواص کا لدنی علم رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ مشہور مسلم کیمیادان جابر بن حیان امام جعفرؑ کا شاگرد تھا اور آپ ہی نے اسے جڑی بوٹیوں کے خواص سے آگاہ کیا تھا۔ امام علی رضاؑ جب مدینہ سے "مرو" کی طرف آتے ہوئے اہواز پہنچے تو طبیعت ناساز ہو گئی آپؑ نے مقامی طبیب کو بلوایا اور اسے خود اس بوٹی کا نام بتایا جو اس بیماری میں اثر انگیز ثابت ہو سکتی تھی۔ آپؑ نے اس بوٹی کے خواص بتائے اور دوا تیار کرنے کا حکم دیا۔ ابوہاشم جعفری کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر طبیب سخت حیران ہوا اور کہا کوئی شخص اس بوٹی کے خواص سے آگاہ نہیں ہے۔

حضرت امام علی رضاؑ کے طب سے متعلق مقولے جو اس دور میں زبان زد عام ہو چکے تھے اس امر کا ثبوت ہیں کہ آپ طبی خواص سے لدنی آگاہی رکھتے تھے چنانچہ اس سے متعلق آپ کے مندرجہ اقوال کتب میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ بچوں کے لئے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں۔

۲۔ سرکہ بہترین سالن ہے جس کے گھر سرکہ ہو وہ محتاج نہ ہوگا۔

۳۔ ہر انار میں ایک دانہ جنت کا ہوتا ہے۔

۴۔ منقی صفرا کو درست اور بلغم کو دور کرتا ہے۔ پٹھوں کو مضبوط بناتا ہے۔

۵۔ شہد میں شفا ہے اگر کوئی شہد ہدیہ کرے تو واپس مت کرو۔

۶۔ گلاب جنت کے پھولوں کا سردار ہے۔

۷۔ بنفشہ کا تیل سر میں لگانا چاہیئے اس کی تاثیر گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم ہوتی ہے۔

۸۔ جو شخص زیتون کا تیل سر میں لگائے یا کھائے چالیس روز شیطان اس کے قریب نہ آئے گا

۹۔ قرآن پڑھنے، شہد کھانے اور دودھ پینے سے حافظہ بڑھتا ہے۔

۱۰۔ گوشت کھانے سے شفا ہوتی ہے اور مرض دور ہوتا ہے۔

۱۱۔ کھانے کی ابتدا نمک سے کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے ستر بیماریوں سے حفاظت ہوتی ہے جن میں جذام بھی شامل ہے (اس مقولے سے مامون واقف تھا اسی لئے اس نے

تین روز نمک سے روٹی کھائی)

۱۲۔ جو دنیا میں زیادہ کھائیگا وہ قیامت میں بھوکا رہے گا۔

۱۳۔ مسور (دال) سترّ انبیاءؑ کی پسندیدہ خوراک تھی اس سے دل نرم ہوتا اور آنسوں بہتے ہیں۔

۱۴۔ جو چالیس دن گوشت نہیں کھائیگا وہ بد اخلاق ہو جائیگا۔

۱۵۔ کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیئے۔

۱۶۔ طول عمر کے لئے، اچھا کھانا، اچھی جوتی پہننا، قرض سے بچنا، کثرت جماع سے پرہیز کرنا مفید ہے۔

معجزاتِ امامؑ

عجز کے معنی عاجز و درماندہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے لفظ معجز بنا ہے جس کے معنی اسم فاعل یعنی عاجز یا درماندہ کرنے والے کے ہوں گے۔ اس طرح یہ لفظ فاعل کے لئے مخصوص ہے لیکن جب اسی لفظ "معجز" میں "ہ" کا اضافہ کر دیا جائے تو لفظ "معجزہ" فاعل کے مخصوص فعل سے متعلق ظاہر کیا جائیگا۔

معجزہ میں ہ کا تخصیص فعل و عمل یا حرکت کیلئے ہے لہٰذا معجزہ کسی فاعل کے ایسے فعل، عمل، حرکت یا اثر کو کہیں گے جس کا نتیجہ دوسرے انسان کو اس فعل و عمل میں عاجز و درماندہ بنا دے۔ اسی کو "خرق عادت" یعنی عادت و معمول کے خلاف فعل کا واقع ہونا بھی کہتے ہیں۔ خرق عادت فعل یا معجزے نبی اور امام برحق سے صادر یا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی عمل اگر کسی ولی یا ماہر روحانیات سے وقوع پذیر ہو تو اسے کرامت اور اگر کافر سے ایسا عمل سرزد ہو تو اسے استدراج کہتے ہیں۔

خرق عادت افعال اور معجزات کی تاریخ میں ایسے مسلمات ملتے ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانوں سے صادر ہوتے رہے اور انہیں معجزہ، کرامت اور استدراجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ سائنسدان خرق عادت افعال و معجزات اور کرامات و استدراجات کی سائنسی توجیہہ کرتے ہیں جو مذہبی عقیدے سے مطابقت نہیں رکھتی ہم اسے زیر بحث لائے بغیر یہ کہنا ضرور پسند کریں گے۔ تاریخی اعتبار سے

ایک اندازے کے مطابق، چوتھی صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی سے بعض انسانوں کو فوق البشر اور بعض کو روحانی و کراماتی ثابت کرنے کے لئے مفروضات کو ان سے منسوب کیا جانے لگا تھا۔

امام علی رضاؑ کے چند معجزات تاریخی طور پر ثابت اور عقل و سائنس کی حدود میں درست پائے گئے ہیں۔ ان میں زینب نامی ایک عورت کا واقعہ بہت زیادہ شہرت کا حامل اور زبان زدِ عام و خاص رہا ہے۔ اور اس کا ذکر معتبر کتب میں بھی ملتا ہے۔

امام علی رضاؑ کے زمانۂ امامت میں "زینب" نامی ایک عورت نے خود کو سیدزادی اور حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کی ذرّیت سے ہونا مشہور کر رکھا تھا۔ وہ اس ذریعے سے بیجا مفاد حاصل کرتی تھی۔ حضرت امام علی رضاؑ کو اس کے متعلق علم ہوا تو آپ نے مناسب تحقیق کی اور اعلان کیا کہ یہ عورت صریحاً جھوٹ بولتی ہے اور اس کا تعلق علیؓ و فاطمہؓ کی آل سے ہرگز نہیں ہے۔

آپؑ کے اس اعلان سے زینب کو سخت صدمہ اور نقصان پہنچا۔ اپنے عقیدتمندوں میں بدنامی کے خوف سے وہ بہت غضبناک ہوئی اور آپ سے بالمشافہ گفتگو کے دوران اس کا اظہار کیا اس نے کہا آپ میرے نسب کو درست قرار نہیں دیتے اگر میں بھی آپ کی نسبت ایسا ہی کہوں تو کیا کسی کے کہنے سے نسب بدل سکتا ہے؟ آپ کو یہ انداز گفتگو ناگوار گزرا، بحث اور فہمائش کو لاحاصل جانتے ہوئے آپؑ اسے اپنے ساتھ لیکر مامون کے پاس آئے اور مامون سے کہا۔" یہ عورت خود کو علیؓ اور فاطمہؓ کی اولاد بتاتی ہے۔ حالانکہ یہ صریحاً جھوٹ بولتی ہے اور اپنے دعویٰ پر بضد ہے اس امر کے فیصلہ کا یہی طریقہ ہے کہ اسے درندوں کی کچھار میں بھیجا جائے اگر یہ سچی ہے تو اسے درندے اپنا لقمہ نہیں بنائیں گے۔ عورت انتہائی دلیر اور چرب زبان تھی اس نے فوراً کہا۔" اگر جیسا کہ آپؑ کہہ رہے ہیں یہ درست ہے تو پہلے آپ خود درندوں کی جائے رہائش میں جا کر دکھائیں۔ امامؑ نے یہ سنتے ہی آمادگی ظاہر کی اور فوراً درندوں کی کچھار میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مامون نے آپؑ کو روکا حاضرین نے بھی ایسا نہ کرنے کی درخواست کی لیکن آپ نہ مانے اور "برکتہ السباع" میں داخل ہو گئے درندے آپؑ کے ارد گرد گھومتے رہے اور آپ کچھ دیر بعد واپس آ گئے۔ اب اس عورت سے کہا گیا کہ وہ اس برکہ میں داخل ہو لیکن وہ چلا کر رونے لگی اور درندوں کے سامنے جانے سے انکار کرتی رہی

لیکن اس کے باوجود اس نے خود کے علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔ نتیجتاً مامون نے زبردستی اس کو درندوں کے سامنے ڈلوا دیا اور درندے اسے چیر پھاڑ کر کھا گئے اور جھوٹ کا فیصلہ ہو گیا۔ بعد میں یہ عورت "زینب الکذابہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ واقعہ یقیناً پیش آیا اور یہ معجزہ وقوع پذیر ہوا۔ لیکن اس معجزے سے متعلق شخصیت اور زمانہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہرحال اس معجزہ کا واقع ہونا عقل و سائنس کی نظر میں محال نہیں ہے۔

۲۔ طلب باراں

"المناقب" میں درج ہے کہ ۲۰۱ھ میں جب مامون نے حضرت امام علی رضاؑ کی ولی عہد خلافت قرار دیا اور لوگوں سے آپ کے حق میں ولی عہدی کی بیعت لی۔ اسی سال بارش بہت کم ہوئی۔ لوگوں میں یہ خیال شہرت پانے لگا کہ یہ بیعت کی نحوست ہے۔ مامون نے حضرت امامؑ سے درخواست کی کہ وہ بارش کے لئے دُعا فرمائیں۔ آپؑ نے آمادگی ظاہر کی مگر یہ بھی فرمایا کہ میں نے رات ہی اپنے جد امجد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔" آپؑ فرماتے تھے کہ روز دوشنبہ تک انتظار کرو بارش ہو گی۔ جب دوشنبہ آیا تو آپ آبادی سے باہر تشریف لے گئے صحرا میں کھڑے ہو کر آپ نے دُعا فرمائی اور حمد و ثنا کے بعد کہا:"

"خداوندا! تو نے ہم اہل بیت کو صاحب منزلت قرار دیا ہے۔ پس لوگوں نے تیرے اس حکم کے مطابق ہم کو اپنا وسیلہ بنا لیا ہے۔ وہ تیرے فضل و رحمت کی خواستگاری ہمارے وسیلے سے کرتے ہیں اور تیرے احسان اور تیری رحمت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ پس تو اے رب العالمین ان پر اپنی رحمت کی بارش فرما دے۔"

راوی علی بن محمد بن سیار اپنے آبا سے مروی اس روایت میں کہتا ہے کہ اچانک بادل گھر آئے تیز ہوا چلنے لگی اور بادل آگے بڑھ گئے بارش نہ ہوئی۔ اس طرح بادلوں کے کئی ریلے آئے اور گزر گئے۔ آخری بادل کے لئے آپؑ نے فرمایا یہ یہاں برسے گا۔ اور یہ بادل ٹوٹ کر برسے اور لوگوں نے اسے امامت کی کرامت تسلیم کر لیا۔

اسی واقعہ کے ساتھ "شیر قالین" والے واقعہ کو منسلک کیا گیا ہے۔ اس واقعہ میں قالین پر شیر کی بنی تصویر شیر بن کر مامون کے حاجب حمید بن مہران کو نگل جاتی ہے کیونکہ اس نے آپ پر طنز کیا

تھا اور کہا تھا: "اگر واقعی آپ صاحب کرامت ہیں تو اس تصویر کو حکم دیجئے وہ مجھے شیر بن کر کھا لے"۔
لیکن ہم سمجھتے ہیں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ صرف عقیدت مندوں کی عقیدت کی انتہا کے سوا کچھ نہیں جو "ہرقل" کے واقعے سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بعض حقیقی تاریخی واقعات کو عقیدت کے طور پر ایسی شخصیتوں سے منسوب کرنا مناسب نہیں ہے۔ جیسے زار روس کی تباہی کو خراسان پر گولہ باری کا نتیجہ قرار دینا یا پردو کو ہوا کے جھونکے سے اڑ جانے کو کرامت میں شامل کرنا۔ ہم اسے خوش اعتقادی کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا مقصود اس سے صرف اس قدر ہے کہ اس قسم کے واقعات سے خوش اعتقادی کا اظہار اور اس کی انتہا کا یقین تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس قسم کی روایات، حقیقی واقعات اور حقیقی معجزات و کرامات کو مشکوک اور غیر حقیقی بنانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ایسا کرنے سے غلط گوئی کا الزام بھی عائد ہو سکتا ہے۔ یہی روایات کو اعتراض اور عقائد میں تخریب کاری کی راہ مہیا کرتے ہیں لہٰذا ایک یا کم سے کم مصدقہ و مسلم معجزات و کرامات بیشمار کمزور اور قابلِ اعتراض معجزات و کرامات سے زیادہ بہتر ہیں۔

چنانچہ آپ کی بیشتر پیش گوئیاں، موجودہ حالات سے مستقبل کے نتائج کا بیان اور کسی انسان کی گفتگو سے اس کے آئندہ کردار کی نقشہ کشی یہ ایسے افعال ہیں جنہیں خرق عادت انسانی میں شمار کیا جا سکتا ہے

۱: علامہ مومن شبلنجی لکھتے ہیں۔ ایک دن حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا۔ عنقریب مامون۔ امین کو قتل کر دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۲: آپ کے عقیدتمندوں نے امام موسیٰ کاظم کی وفات کے بعد ہارون کے ارادوں سے آپ کو آگاہ کیا آپؑ نے جواب میں فرمایا "وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا" اور ہارون باوجود کئی بار ارادے کے آپ کو نقصان نہ پہنچا سکا۔

۳: حسین بن موسیٰ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ جعفر بن عمر العلوی کا ادھر سے گزر ہوا۔ ہم ان کی ہیئت و حالت دیکھ کر اس پر ہنسنے لگے۔ حضرت امام نے فرمایا عنقریب یہ دولت مند ہو جائیگا اور حالت اس سے بہتر ہو جائے گی [illegible] کے اندر مدینہ کا گورنر ہو گیا۔

۴ : جعفر بن صالحؓ سے ایک روز آپ نے فرمایا میری بیوی کے دو جڑواں بچے ہوں گے۔ ایک کا نام علی اور دوسرے کا نام عمر رکھنا۔ جب ہو تو جعفر بن صالحؓ نے اپنی ماں سے پوچھا۔ امام علی رضاؓ نے یہ نام شرگیا نام تجویز کیا۔ اس نے کہا تیری دادی کا نام ام عمر تھا۔ حضرت نے اسی کے نام سے موسوم کیا ہے

۵ : آپ نے ایک شخص کو غور سے دیکھا اور بچہ کہا اسے میرے پاس بلا لاؤ۔ جب وہ قریب آیا تو آپ نے فرمایا۔ "تو وصیت کرلے اور حتمی کیلئے تیار ہو جا۔" اس واقعہ کے تین روز بعد وہ مر گیا۔

۶ : ایک حاجی نے آپ سے بہت سے سوالات پوچھے آپ نے سب کا جواب دیا جب وہ خاموش ہو گیا تو آپ نے اس سے فرمایا وہ سوال تم نے نہیں کیا جو احرام کے لباس سے متعلق تھا جس میں تمہیں شک ہے اس نے کہا ہاں وہ سوال تو میں بھول گیا تھا۔ آپ نے فرمایا اس مخصوص لباس میں احرام درست ہے

۷ : ایک روز آپ بستی سے باہر جنگل میں تشریف لے گئے۔ جاتے وقت فرمایا ہمراہی بارش سے بچاؤ کا سامان اپنے ساتھ ضرور رکھ لیں۔ حسن بن موسیٰ نے کہا، حضور سخت گرمی ہے۔ بارش کے آثار تک نہیں ہیں۔ فرمایا بارش ضرور ہوگی۔ جائے مقررہ پر پہنچنے کے بعد بارش واقعی ہوئی۔

اسی طرح آپ کے اقوال آپ کے تجر علمی کا پتہ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

(۱) صلہ رحم اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے مال میں زیادتی ہوتی ہے۔

(۲) بچوں کا ساتویں دن ختنہ کر دیا کرو۔

(۳) جمعہ کے دن روزہ رکھنا دس روزوں کے برابر ہے۔

(۴) جو کسی عورت کا مہر نہ دے یا مزدور کی اجرت روکے یا کسی کو فروخت کر دے وہ بخشا نہ جائے گا۔

(۵) کھانا پیالے کے کنارے سے کھانا چاہیئے۔

(۶) خدا سے روزی صدقت دے کر مانگو۔

(۷) بالوں کی سفیدی کا سر کے اگلے حصہ سے شروع ہونا سلامتی اور اقبالمندی کی دلیل ہے رخسار یا داڑھی کے اطراف سے شروع ہونا سخاوت کی علامت ہے۔ گیسوؤں سے شروع ہونا شجاعت کا نشان ہے اور گدی سے شروع ہونا نحوست ہے۔

(۸) انسان نہ بالکل مجبور ہے نہ بالکل آزاد۔

جس طرح پہلی صدی ہجری کے نصف سے موضوع احادیث کا رواج ہو گیا تھا اسی طرح چوتھی صدی ہجری سے ایسے موضوعہ و مفروضہ واقعات کا پتہ چلتا ہے جو کرامت و معجزہ کہے گئے اور کسی نہ کسی شخصیت سے منسوب کئے گئے۔ یہ فائدہ بعض موضوعہ احادیث سے بھی اٹھایا گیا بلکہ ایسی موضوع احادیث کا مقصد ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کو کسی دوسری صاحب کرامت شخصیت کے مقابلہ میں صاحب اعجاز و کرامت ظاہر کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مخالف گروہ نے عموماً تین طریقے اپنا رکھے تھے۔ اول یہ کہ وہ اس شخصیت سے متعلق ایک فرضی واقعہ ترتیب دیتے اور اس واقعہ سے ایسے متعلقات اور اشخاص کا ذکر کرتے جو اپنا وجود رکھتے تھے لیکن اشخاص فوت ہو چکے تھے۔ پھر اس واقعہ کے ایجاز سے متعلقہ شخصیت کو صاحب کرامت معجزہ ظاہر کرتے۔ دوم کسی حقیقی اور تاریخی واقعہ میں ترمیم و اضافہ کر کے کسی شخصیت سے منسوب کر دیتے۔ سوم حدیث میں اضافہ سے فائدہ اٹھاتے اس کا سبب عصبیت اور مسابقت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ معجزات و کرامات، انسانی معمولات میں شامل نہیں ہوتے یہ انتہائی خاص، اہم اور مشکل حالات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ان اعمال و افعال کو "خرقِ عادتِ انسانی" کہا گیا ہے۔ یعنی معمولات و عادتِ انسانی سے ہٹ کر کسی فعل و عمل اور حرکت و اثر کا واقع ہونا اور یہ بار بار نہیں ہوتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں فطرت الہیہ کے اٹل قوانین اور پہلے سے مرتب نظام قدرت میں وقتی طور پر خلل پیدا ہوتا ہے اور فطرت اسے پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا معجزہ، کرامت اور استدراج وہی ممکن اور درست ہیں جو محالِ فطری نہ ہوں چاہے معمولات و عادتِ انسانی کے خلاف ہوں۔

حضرت امام تمام [illegible] تبلیغ و تدریس دین فرماتے رہے۔ اگرچہ آپ کو اپنے آبا کی طرح خلفائے وقت کے عتاب اور ان کی عائد کردہ پابندیوں سے واسطہ رہا۔ لیکن آپ نے تبلیغ و تدریس دین نبوی سے کبھی اغماض نہیں برتا۔ علم الرجال کے ماہرین نے اقرار کیا ہے کہ ان دشواریوں کے باوجود بڑی تعداد میں لوگ آپ سے علمی استفادہ حاصل کرنے کے لئے متبع رہتے تھے [illegible] کرتے تھے آپ کے روایت کی وہ تعداد جو کتب معتبرہ میں درج ہیں۔ آپ [illegible] عکاسی کرتی ہے چنانچہ حسین بن بشار، ابراہیم بن محمد الاشعری [illegible] السراد، عبد اللہ بن حماد [illegible] احمد بن محمد عیسیٰ الاشعری علی بن [illegible]

الہروی، ابوجریر القمی، محمد بن سنان، یونس بن عبد الرحمن، علی بن عبداللہ العلوی، حسین بن قیاما، حمزہ بن بزیع، داؤد بن سلیمان قزوینی، حسین بن مہران، زکریا بن آدم، صفوان بن یحییٰ وغیرہ آپ کے معتبر راوی اور شاگرد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ سے روایتیں کی ہیں۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو آپ کے والد سے بھی روایت کرتے تھے۔ بعض ان میں سے اپنے وقت کے شیخ و فقیہہ بھی ہوئے بعض انتہائی عبادت گزار ہوئے اور بعض نے تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ بعض کے حق میں حضرت امام کی جنتی ہونے کی بشارت بھی ملی ہے

ایک شخص دعبل بن علی جس کا تعلق قبیلہ خزاعہ سے تھا اپنے وقت کا بہترین شاعر، بلند مرتبہ قصیدہ گو۔ دعبل کو بھی حضرت امام رضاؑ کے اصحاب میں شمار کیا گیا ہے۔ دعبل نے چار ائمہ اہلبیت امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کا زمانہ پایا۔ یہ دعبل ہی ہے جس نے مامون کے حق میں ہجویہ اشعار کہے۔ اس نے ایک بار ایک شعر میں کہا۔

"اے مامون! میری ہی قوم نے تیری گمنامی کو شہرت دی اور تجھکو پستی سے [illegible] بلندی پر پہنچا دیا"

مامون نے یہ ہجو سنی تو صرف اتنا کہا کہ "دعبل نے غلط کہا، میں گمنام کب تھا پیدا ہوا [illegible] خلافت کی آغوش میں اور دودھ پیا [illegible] کی چھاتیوں سے (المامون ص۱۲۹)

چونکہ عباسی خلفاء حکمران اور عباسی امراء آل علیؑ کے ساتھ سختیاں اور ناانصافیاں کر [illegible] تھے اس لئے دعبل حکمرانوں کی قلعی اپنے اشعار کے ذریعہ کھولتا رہتا تھا ایک بار مامون کے چچا ابراہیم کی ہجو لکھ ڈالی۔ ابراہیم مامون کے پاس آیا اور دعبل کی شکایت کی۔ اس نے کہا "دعبل کی بدزبانیاں حد سے گزر گئی ہیں۔ اس نے [illegible] ایسی ہجو کہی ہے جس پر [illegible] درگزر [illegible] ہے" ابراہیم نے اس ہجو کے کچھ اشعار بھی مامون کو سنائے مامون نے کہا "چچا جان [illegible] نے میری ہجو اس سے بڑھ کر لکھی ہے اور چونکہ میں نے درگزر کی ہے امید ہے آپ بھی زبان بند کر لیں گے" علامہ شبلی لکھتے ہیں "دعبل کی بیہودہ گوئی کی وجہ سے سارا دربار ناراض تھا۔ ابوسعید مخزومی نے [illegible] مامون [illegible] درگزر [illegible] مامون نے کہا "اگر بدلہ ہی لینا ہے تو تم بھی [illegible] لکھو [illegible] جو کچھ کہتا ہے غلط کہتا ہے [illegible] (المامون ص۱۲۹)

علامہ شبلی [illegible] مامون [illegible] دعبل [illegible] دعبل کے بارے میں [illegible] مامون [illegible] علانیہ حق [illegible] بے خوف تھا [illegible] دعبل کو

اپنا مطیع کرے لیکن مامون اور دیگر عباسیوں کے اس سلوک کی بنا پر جو وہ اہلبیت کے ساتھ کرتے تھے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ دعبل ہی تھا جس نے امام علی رضاؑ کو ہارون کی قبر کے پاس دفن کرنے پر یہ شعر کہا تھا ۔

ماینفع الرجس من قرب الزکی ولا ❊ علی الزکی بقرب الرجس من ضرر

یعنی ناپاک آدمی کو پاک کے قرب سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ پاک کا اس کے قرب سے کچھ نقصان ہوتا ہے (المامون ص۲۶۳) علامہ شبلی کہتے ہیں کہ امام علی رضاؑ کو ہارون رشید کے قریب دفن کرانے سے مامون کا مدعا یہ تھا کہ ہارون بھی امام علی رضاؑ کی برکت سے مستفید ہو لیکن دعبل نے کہا ہے کہ اس طرح ناپاک (ہارون) کو پاک (امام رضاؑ) کی قربت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور نہ ہی پاک (امام رضاؑ) کو ناپاک (ہارون) کی قربت سے کوئی نقصان پہنچے گا۔ دعبل واقعی دعبل تھا، دعبل ہرگز نہیں تھا اس کا تحریری و تاریخی ثبوت یہ ہے کہ مامون کو اپنے باپ ہارون کے حق میں دعبل کے اس اظہار کو برداشت کرنا پڑا، وہ دعبل کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

دعبل نے حضرت امام علی رضاؑ اور اہلبیت کی شان میں بہت سے قصائد کہے ہیں۔ ان میں ایک قصیدہ اس کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے یہ قصیدہ "مدارس آیات" کے نام سے عربی قصائد کی تاریخ میں شہرت رکھتا ہے۔ دعبل نے اس قصیدہ میں اہلبیت اطہار کے مدارج ان کا اللہ اور مخلوق کے درمیان وسیلہ ہونا، دشمنان اہلبیت اور انکی دشمنی کی وجوہات، واقعہ کربلا اور مظالم کی تفصیل، اہلبیت رسولؐ سے اپنی دلی عقیدت ان پر ایمان اور خلوص کا بڑے ہی پُر اثر انداز میں ذکر کیا ہے۔

دعبل کے علاوہ اس وقت کے دو مزید شاعر "ابونواس" اور "ابراہیم الصولی" کے نام بھی اس فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں جو شعرائے اہلبیت رسول کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ "ابونواس" وہی شاعر ہے کہ جب اس سے یہ کہا گیا کہ "تو نے ہر مضمون کے شعر لکھے لیکن حضرت علی رضاؑ جو فخر روزگار ہیں۔ انکی شان میں دو شعر بھی نہ کہے تو اس نے جواب دیا کہ" ان کا پایہ کمال میری پہنچ سے بہت بلند ہے"۔ "ابونواس" نے اہلبیت و دیگر ائمہ کی شان میں قصائد لکھے ہیں۔

ازواج و اولاد

تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے اکثر ائمہ اہلبیتؑ کی ان ہی بیویوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے بطن سے مستقبل کے امام پیدا ہوئے۔ باقی ازواج کا ذکر یا تو کا حقہٗ جان کر ترک کر دیا گیا ہے یا ان کی شہرت اس پایہ کی نہیں تھی کہ یقین کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا اس لئے تمام ازواج کا تذکرہ بالیقین نہیں ملتا۔ بسا اوقات ان ازواج کا ذکر شک و شبہ کے ساتھ روایتی انداز میں کیا جاتا ہے اور ان کی تعداد بھی کم و بیش بیان کی جاتی ہے۔

یہی انداز حضرت امام علی رضاؑ کی ازواج کے تذکروں میں بھی ملتا ہے۔ آپ کی وہ زوجۂ مطہرہ جن کے بطن سے امام نہم حضرت محمد تقی الجوادؑ متولد ہوئے۔ ان کا نام ریحانہ اور لقب خیزران تھا اور یہ محترم خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زوجۂ محترمہ حضرت ماریہ قبطیہ کے قبیلہ اور خاندان سے تھیں۔

آپ کی ایک اور منکوحہ اُمِ حبیبہ تھیں جو مامون الرشید خلیفہ عباسی کی بیٹی تھیں۔ مامون کی بیٹی ام حبیبہ سے نکاح ۲۰۲ھ میں اس وقت ہوا جب آپؑ کو مامون نے خراسان بلا کر ولی عہد خلافت بنایا اور خود مامون نے خطبہ دیا۔ مامون کا یہ خطبہ تواریخ میں درج ہے۔ ۲۰۳ھ میں زہر خورانی سے آپؑ کی وفات ہو گئی۔ اس لئے ام حبیبہ سے آپ کو کوئی اولاد نہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مزید چار بیویوں کا ذکر مختلف کتب سیرو تاریخ میں ملتا ہے۔ جو روایتی انداز لئے ہوئے ہے اسی سبب سے ان کے متعلق کوئی حتمی و یقینی تفصیل دستیاب نہیں۔

اسی طرح آپ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں حتمی و یقینی اعداد میسر نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد چھ بتائی گئی ہے اور کم سے کم ایک۔ اولاد کے متعلق تفصیلات نہ ملنے کا سبب وہی ایک خلفائے بنو عباس کے ظلم و تعدی کا سلسلہ دراز ولا متناہی تھا جس کی وجہ سے بسا اوقات کسی نرینہ بچے کی پیدائش کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت یوسف کے بعد کے فرعون کو جب یہ خطرہ پیدا ہوا کہ عبرانی ہم سے سلطنت چھین لیں گے تو اس نے یہ حکم دیا کہ دائیاں جب عبرانی عورتوں کے بچے جنوائیں تو لڑکے ہوں تو قتل کر دیں لڑکیاں ہوں تو جیتا چھوڑ دیں۔ اس کی تائید بائیبل صاف الفاظ میں کرتی ہے۔

> "تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے جن میں ایک کا نام "سفرہ" اور دوسری کا "فوعہ" تھا باتیں کیں۔ اور کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے لیکن وہ دائیاں خدا سے ڈرتی تھیں سو انہوں نے مصر کے بادشاہ کا حکم نہ مانا۔"

(بائبل کتاب خروج باب اول ۱۵ تا ۱۷)

بائبل کے مطابق فرعون مصر کو عبرانیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور قوت سے خطرہ تھا کہ وہ آگے چل کر حکومت مصر پر قبضہ نہ کر لیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے غاصب خلفاء کو بھی آل علیؑ کی جانب سے یہی خطرہ در پیش رہا کہ وہ برابر اپنے حق خلافت کا دعویٰ کرتے آ رہے تھے اور اسی سبب سے وقتاً فوقتاً خروج ہوتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اسی طرح ائمہ اہلبیت کی نرینہ اولاد پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ ہر امام نظر بندی کی حالت میں زندگی گزارتا رہا۔ ان کے گھر سے باہر جانے اور سفر کرنے پر سخت پابندی عائد تھی۔ اور جب یہ لوگ موقع پاتے انہیں زہر سے قتل کرتے یا تلوار کے ذریعہ اجرتی قاتلوں سے قتل کرا دیتے۔ ایسے کھلے واقعات اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ یہی سبب تھا کہ امام وقت اپنی نرینہ اولاد کی پرورش مختلف مقامات پر خفیہ طریقہ سے کرنے کا انتظام کرتا۔ اس طرح نہ تو صحیح تعداد کا علم عام لوگوں کو ہوتا اور نہ ہی ان کے نام و نشان ملتے۔ بلوغت کے بعد یہ خود کو ظاہر کرتے۔ نیز جاسوس یہ پتہ لگا کر کہ یہ حقدار و دعویدار خلافت ہیں انہیں قتل کروا دیتے۔ ان حالات میں ائمہ مجبور تھے کہ وہ ازواج و اولاد کی نشاندہی اسی حد تک کریں جو زمانے انہیں روایت کے ذریعہ ... کا علم ہو سکے۔

بہت بعد تب جب شیعوں کیلئے تصنیف و تالیف کا راستہ کھلا تو مصدقہ معلومات فراہم کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ ائمہ کے راویوں کے ذریعہ سینہ بسینہ روایات سے بھی اولاد سے متعلق معلومات ملنے مشکل تھیں۔ راوی صرف ان حقائق سے ہی واقف تھے جو وہ سنتے اور دیکھتے تھے۔ اہل سنت مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ائمہ اہلبیت سے متعلق ازادتاً کوئی کتاب نہیں لکھی [illegible] واقعات کے ذیلیات یا متعلقات سے جو کچھ علم ہو سکا [illegible] چنانچہ حضرت امام علی رضاؑ کی اولاد کے متعلق علامہ ابن شہر آشوب اور [illegible] بیٹے کے ہونے کا ذکر کیا ہے جن کا نام محمد بن علی الجواد تھا۔ اسی کی [illegible] ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسی روایات بھی ہیں جن کی رو سے امام کے [illegible] ثابت ہوتا ہے چنانچہ علامہ مجلسی جو ملا باقر کے نام سے موسوم ہیں اپنی کتاب بحار الانوار میں دو بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے ایک کا نام محمد اور دوسرے کا نام موسیٰ بتاتے ہیں لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہی اپنی اس کتاب میں "عیون اخبار الرضاؑ" نامی کتاب کے حوالے سے فاطمہ بنت امام رضاؑ کی روایت بیان کرتے ہیں جس میں صرف ایک لڑکے امام محمد تقی کا ہونا بیان کیا ہے اور اس پر اصرار کیا ہے کہ اسکے علاوہ آپ کی دیگر اولاد کی تعداد اور نام بتانا ممکن نہیں ہے۔ یہ لڑکی خود حضرت امام رضاؑ کی بیٹی ہیں اور صرف امام محمد تقیؑ کا نام بتاتی ہیں دوسروں کیلئے مجبوری ظاہر کرتی ہیں۔ اسی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اپنی اولاد کی پرورش خفیہ رکھتے تھے کہ ایک بہن کو بھی اپنے بھائیوں کے ہونے کا یقین تو ہے لیکن لیکن یہ علم نہیں کہ وہ کتنے اور کون کون تھے ؟

علامہ سبط ابن جوزی "تذکرۃ الخواص الامۃ" میں پانچ بیٹے محمد (امام تقیؑ)، ابو محمد الحسن، ابراہیم جعفر، ابو جعفر الثانی اور ایک بیٹی بتاتے ہیں۔ ملا محمد باقر معروف مجلسی بھی اپنی دوسری کتاب "تذکرۃ الائمہ" میں تحقیق مزید کے طور پر پانچ بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ان کے نام محمد تقیؑ، جعفر، ابراہیم، حسنؑ اور حسینؑ لکھے ہیں اور ایک بیٹی [illegible] ہے۔ اسی طرح "مطالب السئول" کے مولف کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی آپ کی اولاد [illegible] تے ہیں جن میں پانچ لڑکے محمد (امام محمد تقیؑ) حسن حسین، جعفر اور ابراہیم، ایک لڑکی [illegible] کو تحریر کیا ہے اور فاطمہ بنت اپنے والد حضرت امام علی رضاؑ سے [illegible] بھی کرتی ہیں۔ [illegible] تعداد اور نام "کشف الغمہ" کے مولف اربلی نے

ثابت کیے ہیں۔ آپؑ کی اولاد کی تعداد ایک سے بڑھ کر چھ تک پہنچتی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی زمانہ کے ساتھ مزید تحقیق اس تعداد کو آٹھ کے عدد پر ختم کرتی ہے۔

کاشان کے ایک بزرگ عالم "مرتضیٰ علم البدیٰ" کا نام اسی سلسلۂ تحقیق کے ضمن میں بڑی شہرت کا حامل ہے۔ آپ نے نہ صرف حضرت امام علی رضاؑ کے بیٹوں کی تعداد آٹھ لکھی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کے معلوم حالات کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ کون کہاں کس حال میں قاتلین کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ وہ آٹھ فرزندوں کے یہ نام بتاتے ہیں۔

"امام محمد تقی، جعفر، حسین، ہادی (حسن)، ابراہیم، علی، یعقوب اور یوسف۔"

علامہ مرتضیٰ علم البدیٰ کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ جب مامون نے حضرت امامؑ کو زہر سے شہید کر دیا بغداد میں اس کے داخلہ کے وقت اہل بغداد نے اس کا پرجوش استقبال کیا عرب اور بنو عباس اس کے مطیع ہو گئے اس نے سادات کا سبز شعار رنگ متروک قرار دیدیا۔ اس نے مصلحتاً اپنے ان نظریات سے رجوع کر لیا جو آلِ علیؑ کے نظریات سے مطابقت کرتے تھے۔ پھر اس نے علویوں سے مراعات واپس لے لیں اور ان کا داخلہ دربار میں بند کر دیا اور اسی کے ساتھ جب ابراہیم بن تابوہ کو اپنا مطیع بنا لیا اور پوری اسلامی مملکت پر اپنا سکہ بٹھا لیا تو اس کے گرد ایسے لوگ جمع ہو گئے جو آلِ علیؑ کے مخالف تھے انہوں نے موقع و محل کے مطابق اسے بھڑکانا شروع کیا تو ۲۰۳ھ کے قریب امام رضاؑ کی اولاد نے اپنے اپنے مقام سے خفیہ طور پر منتشر ہونا شروع کیا۔ تقیہ اور گمنامی کی زندگی کو اپنا محافظ بنایا۔ مامون نے ان کے پیچھے اپنے جاسوس مقرر کئے چنانچہ جہاں جس کے متعلق معلوم ہوتا کہ یہ امام زادہ ہے اسے قتل کر دیا جاتا۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ شہریار کے علاقہ میں سلمان آباد گاؤں میں ابراہیم بن جعفر کو جبکہ وہ ایک چشمے کے قریب بیٹھے تھے دمشق کے ایک باشندہ منصور نامی نے انہیں قتل کر دیا۔ زمانے کے ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق ابراہیم، فرزند امام رضاؑ کی قبر "قوچان" کے قریب ہے۔

حسن اور حسین نامی دو بیٹے "قزوین" چلے گئے تھے۔ ان کے متعلق ایک انتہائی دردناک صورت بیان کی جاتی ہے جو اس وقت پیش آئی اور ان دونوں بھائیوں کے قتل کا سبب بنی۔ لکھا ہے کہ یہ دونوں بھائی قزوین میں داخل نہیں ہوئے شہر سے باہر رک گئے اور اپنے ایک محافظ "یار محمد" کو شہر بھیجا تاکہ وہ پہلے کوئی محفوظ مقام تلاش کر لے۔ اسی دوران آبادی کے اندر سے شور و غل کی آواز آنا شروع ہوئی۔ خیال ہوا کہ یار محمد کو کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہو۔ حسین اس خیال سے آبادی میں داخل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ یار محمد

آ رہا ہے، جو کوئی محب امام رضا تھوڑا سا پانی میرے اوپر ڈالدے" حسین نے یہ الفاظ اس بوڑھے نابینا سے سنے تو آپ نے ایک پیالہ پانی بھر کر اسے دیدیا، مگر اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور شور مچادیا کہ "دوڑو، پکڑو، یہ محب اہلبیت ہے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور حسین کو قتل کر دیا"

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مقررہ جاسوس اور دشمنانِ اہلبیت وآلِ علی امام زادوں اور محبانِ آلِ علی کو تلاش کرنے میں کیا طریقے استعمال کرتے تھے۔

حسین کے بھائی حسن کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے "قزوین" کے ایک محلہ میں ایک نیک دل شخص کے گھر پناہ لی۔ چند روز بعد یہ راز فاش ہونے پر جاسوس نے انہیں گرفتار کر کے حاکم قزوین کے سامنے پیش کر دیا اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ امام زادہ ہے قتل کا حکم دے دیا۔ آپ کا ایک بیٹا داؤد نامی تہران کے پہاڑی علاقہ میں روپوش رہا، وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون بنا آپ کا مدفن بعد میں مرکز خلائق بنا کیونکہ آپ بہت عبادت گزار اور صاحب کرامت تھے کہتے ہیں شہنشاہ ایران رضا شاہ اسی جگہ موسم گرما گزارا کرتا تھا۔

مامون نے حضرت امام رضاؑ کی وفات اور پوری طرح اقتدار کلی حاصل کرنے کے بعد جو طریقہ کار سادات وعلویین کے حق میں اختیار کیا اس کا جواز علامہ شبلی یہ پیش کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مامون ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جب ان (امام رضا) کو زہر دے دیا گیا اور مامون کو پورا تجربہ ہو گیا کہ جو (عباسی) خاندان ڈیڑھ سو برس سے خلافت پر قبضہ کرتا چلا آ رہا ہے وہ کسی طرح اپنے فرضی حق سے باز نہیں آسکتا۔ مجبوراً اس نے بھی وہی کیا جو اس کے اسلاف (علویوں کے ساتھ) کرتے آئے تھے" (المامون صفحہ ۱۰۶)

امام زادہ حسن جن کو حاکم قزوین کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کی اولاد سے دو لڑکے عبداللہ اور عبدالرشید جو اس وقت کمسن تھے قزوین ہی میں رہے اور حالات کی بہتری کے ساتھ ساتھ اسی جگہ آباد ہو گئے لیکن انہی حسن (بن علی رضا) کے ایک بیٹے جن کا نام محمد تقی تھا خفیہ اور پوشیدگی کی حالت میں علاقہ "سبزوار" میں پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان ہی کی اولاد میں آگے چل کر وہ سلسلہ آتا ہے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر (حال ضلع سکندرآباد) کا سلسلہ سادات رضویہ کہلایا۔

حسن بن امام علی رضاؑ کی اولاد

حسن بن علی رضاؑ کے پانچ صاحبزادے محمد تقی، عبدالرشید، عبداللہ، محسن داؤد اور محمود مسعود ہوئے۔ ان میں سے دو بیٹے عبداللہ و عبدالرشید قزوین آباد ہو گئے۔ محمد تقی کی اولاد نقل مکانی کر کے یہاں سے سبزوار (ایران) پہنچی اور وہاں ساتویں صدی ہجری تک آباد رہی

محمد تقی بن حسن بن امام علی رضاؑ کے بیٹے سید علی اوری کے دو فرزند سید جلال اور سید نعمت اللہ ہوئے۔

سید جلال کے تین بیٹے سید محمود (برقعہ پوش) سید محمد اور شاہ میر ہوئے۔

(۱) سید محمود (برقعہ پوش) لاولد رہے۔

(۲) سید محمد کے ایک فرزند سید علاؤالدین ہوئے اور سید علاؤالدین کے دو بیٹے سید صبیح اور سید علی ہوئے۔

(۳) سید شاہ میر کی اولاد میں ایک بیٹے کا نام سید حسن تھا۔

سید محمد تقی بن حسن علی رضاؑ کی یہ اولاد سبزوار میں مقیم رہی یہاں تک کہ ۶۵۶ھ مطابق سنہ ۱۲۵۶ء میں ہلاکو خان نے عراق اور پھر ایران پر جارحانہ حملوں کا آغاز کیا۔ اسی ہنگامۂ کشت و خون اور گیرو دار میں سبزوار سے نقل مکانی پہ مجبور ہونا پڑا۔

آلِ علی کیلئے پورے عرب میں کوئی جائے پناہ نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو زید کیوں اپنے اجداد کے وطن مکہ اور اپنی جائے پیدائش مدینہ کو چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ایران کا رُخ کرتے؟ اس وقت عراق اور ایران چنگیز خان کی اولاد کے ہاتھوں تاخت و تاراج اور کشت و خون کا مسکن بنا ہوا تھا۔ کسی شخص کی جان، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی اس لئے سبزوار میں آباد سید حسن کی اولاد نے بھی نقل مکانی

کا قصد کیا۔ لیکن ایران کے سرحدی علاقے محفوظ نہ تھے۔ افغانستان بھی حملہ آوروں کی جولانگاہ تھا۔ قریب ترین ملک ہندوستان جو دراوڑ، بھیل اور گونڈ وغیرہ قدیم وحشی قبائل کا مسکن تھا اور جہاں اب ان کی بت پرست اولاد مہذب معاشرے کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی، مسلمان فاتح گیارہویں صدی عیسوی سے اس ملک میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے جنوبی ہند، بنگال اور دہلی میں حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ سید محمود برقعہ پوش لاولد تھے۔ جب انہوں نے ہندوستان کی طرف کوچ کا ارادہ کیا تو آپ کے بھائی سید میر کے بیٹے سید حسن یعنی آپ کے بھتیجے اور ان کا کنبہ آپ کے ساتھ تھا۔ ہندوستان آکر ان لوگوں نے بنگال میں قیام کیا۔ جہاں غیاث الدین کی حکومت تھی۔

عرب سے باہر سادات کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ غیر عرب، تمام نو مسلم، آلِ رسول سے عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن سادات عظام اکثر اپنی سیادت کو مصلحتاً خفیہ رکھتے تھے۔ اگر کسی طرح ان کا اولادِ رسول ہونا ظاہر ہو جاتا تو لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع رہتے اور ان کی خدمت کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ اس میں شاہ و گدا کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ شہنشاہ بھی اسی طرح عجز و انکسار سے پیش آتے جس طرح عوام الناس۔ چنانچہ جب ایک مدت بعد غیاث الدین شاہ بنگالہ کو سید محمود برقعہ پوش کی سیادت و کرامت کا علم ہوا تو وہ چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب و نسب کے بارے میں معلومات حاصل ہونے پر محلِ شاہی کا ایک حصہ آپ کی رہائش کے لئے پیش کیا۔ لیکن آپ نے اسے منظور نہیں کیا۔ اس وقت تک سید محمود کے برادر زادہ سید حسن بھی بلوغ کو پہنچ چکے تھے شاہ غیاث الدین نے اپنی ایک بیٹی کو سید حسن سے بیاہ دیا، جس کے بطن سے سید حسن کے سات بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

سید میر حسین، سید بندگی معظم، سید موسیٰ، سید ابراہیم، سید ناصر، سید زین العابدین اور سید اسحاق۔

ایک مدت بعد ایران میں سیاسی حالات کے بہتر ہونے کی اطلاعات ہندوستان پہنچنا شروع ہوئیں۔ سید محمود اور سید حسن نے ایران واپسی کا ارادہ کیا۔ غیاث الدین نے بڑی کوشش کی کہ آپ یہیں مقیم رہیں۔ مگر یہ لوگ رضامند نہ ہوئے۔ اس نے حفاظتی دستہ ساتھ کر دیا لیکن جب آپ کا قافلہ ملتان جاتے ہوئے مبارک شاہ تغلق کے خطۂ محروسہ علاقہ سے گزرا تو مبارک شاہ نے آپ کو یہ کہہ کر

پنہا بنہاں بتایا کہ چند روز آرام کر کے آگے روانہ ہوں۔ سید محمود نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اور دہلی میں قیام پر رضامند ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ غیاث الدین نے مبارک شاہ خلجی کو الگ سے خط بھیجوں تھی اور سید شاہ و سید حسن کو رکنے کی درخواست کی تھی۔

سید محمود برقعہ پوش دہلی سے دو تین میل کے فاصلہ پر "نبروی" نامی ایک بستی کے نزدیک جنگل میں قیام پذیر ہوئے۔ کیونکہ آپ عبادت گزار و تنہائی پسند تھے لیکن جو سید حسن کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی تھے لہٰذا انہوں نے دہلی میں قیام کیا۔ آپ کو دربار شاہی میں مدعو کیا جاتا تھا۔ اور آپ مبارک شاہ خلجی کو اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔ وہ خود اہم معاملات میں آپ سے مشوروں کا طلبگار ہوتا تھا۔

ہندوستان ان دنوں ویدک اور جینی بت پرستوں کی سرزمین تھی لیکن مسلمان فاتح حکمرانی کر رہے تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت کو مسلمانوں کی اقلیت کی حکومت اپنی سرزمین پر گوارا نہ تھی۔ ہر مسلم حکومت میں ہندو راجہ اور جاگیردار موجود تھے۔ آئے دن راجہ چھوٹے بہانے پر بغاوت کرتے۔ ہندو رعایا کے باغیانہ جذبات ابھارتے۔ ان کی راجدھانی میں جو ہندو مسلمان ہو جاتے انہیں طرح طرح سے پریشان کرتے اور کبھی کسی نہ کسی بہانے سے مالیانہ دینے میں لیت و لعل یا انکار کر دیتے۔ ان ہی دنوں پرگنہ "ڈاسنا" اور "دکھور" کے راجہ نے اپنے علاقہ و تعلقہ کی مسلمان اقلیت کو پریشان کرنا شروع کیا وہ ان پر ناجائز پابندیاں لگا کر زیادتی کرتا۔ ان کی عورتوں کو رسوائی سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس کا مقصد تھا کہ وہ مذہب اسلام ترک کر دیں۔ کچھ عرصہ انہوں نے برداشت کیا اور کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر اس علاقہ کے چند بزرگ مسلمان خلجی کے دربار میں فریاد لیکر دہلی حاضر ہوئے۔ راجہ کی شکایت کی اور اسکے ظلم و ستم سے بچانے کی درخواست کی۔

چونکہ یہ مسئلہ سیاسی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی بھی تھا لہٰذا بادشاہ نے سید حسن سے جو اس وقت دربار میں موجود تھے اس مسئلہ کے حل میں مدد چاہی اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی آپ سے گزارش کی۔ شاہ سید حسن نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ آپ فوراً اپنے چچا سید محمود برقعہ پوش کی خدمت میں نبروی کے قریب ان کی قیامگاہ پر حاضر ہوئے۔ تمام واقعہ بیان کیا اور یہ بھی کہ شاہ دہلی نے اس

ع۔ یہ مقام اب بھی موجود ہے دہلی سے قطب مینار جاتے ہوئے قریب ہی بائیں جانب کوئی دو سو قدم کے فاصلہ پر ہے۔

مسئلہ کو حل کرنے کیلئے یہ مہم ان کے سپرد کی ہے۔ یہ سنکر سید محمود نے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر اپنے برادر زادہ سید حسن سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تم نے اچھا کیا کہ اس مہم کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ معاملہ کفر و اسلام کا ہے اور اسلام کی حفاظت و تبلیغ ہمارا آبائی فرض ہے۔ تم بلا تاخیر مہم پر روانہ ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس مہم میں فتح و کامران ہو گے۔"

سید حسن اپنے بزرگ چچا کی اجازت اور دعائیں لیکر دہلی لوٹے۔ بادشاہ نے ایک ہزار آزمودہ کار جنگجو آپ کے ہمراہ کئے۔ سید حسن نے اپنے بیٹوں کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا اور مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ مقابلہ ہوا اور راجہ شکست کھا کر قریب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو گیا اور اسی روپوشی کی حالت میں اپنے مرکزی مقام کو لوٹ گیا۔

میر سید حسن جنگی جگہ کی راہوں سے واقف نہ تھے اس لئے مع لشکر ابھی اسی جگہ فروکش تھے کہ آپ کو مخبروں کے ذریعہ خبر ملی کہ راجہ اپنی بیٹی کے ہمراہ "گڑھ مکتیشر" دیوتاؤں سے مدد کیلئے جا رہا ہے۔ آپ نے اپنے چند جانباز لباس تبدیل کرا کے راستہ پر متعین کر دیئے اور لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ راجہ اپنی لڑکی کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ سید میر حسن نے فتح و کامرانی کے شادیانوں کے ساتھ ان دونوں کو مبارک شاہ کے حضور پیش کر دیا۔ کہتے ہیں کہ راجہ کی بیٹی نے بخوشی اسلام قبول کر لیا اور مبارک شاہ نے اسے میر سید حسن کے حوالہ کر دیا۔ آپ نے اس کا نام تابندہ بی بی تجویز کیا اور اپنے بڑے بیٹے سید ناصر کی زوجیت میں دیدیا۔ تابندہ بی بی کے بطن سے سید ناصر کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ؏ سید محمود (برقعہ پوش) کی وصیت کے مطابق "سید محمود ثانی" رکھا گیا۔ ایک تحقیق یہ بھی ہے۔ سید محمود ثانی۔ تابندہ بی بی کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ آپ سید ناصر کی کسی دوسری زوجہ سے ہیں۔

؏ سید محمود (برقعہ پوش) دہلی کے نزدیک [illegible] کے راستہ میں اپنی قیامگاہ پر فوت ہوئے۔ اور وہیں دفن ہوئے [illegible] ایک عقیدتمند نے آپکا مقبرہ بنوایا۔ مگر مقررہ شرط کے مطابق پہلے فوت ہونے کے سبب وہ [illegible] دفن کیا گیا اور سید محمود برقعہ پوش انکے بعد فوت ہونگے سبب گنبد سے باہر چہار دیواری کی حد میں مدفون ہوئے۔ [illegible] بھی آپکی کرامات سے متاثر اور معتقد تھے [illegible] کہتے تھے۔ [illegible] سے کن جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانان عقیدتمند [illegible]

[illegible]

پر علاؤ جہان راجہ سے جنگ کے دوران "سید میر حسن" قیام پذیر ہوئے تھے۔ مبارک شاہ خلجی نے آپ کو آپ کی جنگی خدمات کے صلہ میں مرحمت کر دیا تھا۔ دراصل غیاث الدین کی خواہش کے مطابق اس کا مقصد یہی تھا کہ آپ ہندستان چھوڑ کر واپس ایران نہ جائیں۔ چنانچہ آپ کی اولاد اسی مقام پر آباد ہوئی۔ جو بعد میں جارچہ کہا گیا۔ لیکن آپ خود دہلی دربار سے منسلک رہے اور جب آپ کی وفات دہلی میں ہوئی تو آپ کو آپ کے چچا سید محمود کے قریب مہرولی میں دفن کیا گیا۔

میر سید حسن کی وفات کے ایک مدت بعد ان کی اولاد میں کسی سبب سے باہم نزاع و نفاق پیدا ہو گیا اور ہر ایک جس کا جس طرف منہ اٹھا چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ

(۱) سید حسن کے بڑے صاحبزادے سید نامر کشمیر چلے گئے وہیں وفات پائی وہیں دفن ہوئے آپ کی اولاد کشمیر میں آباد رہی۔ بعد میں کچھ افراد دوبارہ جارچہ آکر آباد ہو گئے تھے۔

(۲) سید ابراہیم، ضلع ایٹہ کے ایک قصبہ جلیسر میں آباد ہو گئے وہیں دفن ہوئے۔

(۳) سید موسیٰ دہلی میں فوت ہوئے اولاد جارچہ میں رہی مگر ناراض ہو کر دوسرے مقام پر منتقل ہو گئی۔

(۴) سید اسحاق جارچہ میں رہے وہیں فوت اور دفن ہوئے بعد میں کچھ افراد ضلع انبالہ چلے گئے تھے۔

(۵) سید شیخ معظم بداؤں چلے گئے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔ بداؤں میں آپ کا مزار ہے کچھ اولاد بعد میں جارچہ آکر آباد ہو گئی اور کچھ افراد پنجاب میں آباد رہے۔

(۶) سید میر سراج، سرہند کی طرف کوچ کر گئے اور وہیں آباد رہ کر فوت ہوئے۔

(۷) سید زین العابدین، راجہ سے لڑائی کے دوران شہید ہوئے۔ ان کی نسل بعد میں جارچہ ہی میں مقیم رہی۔

اس افتراق و انتشار کے کوئی چالیس سال بعد سید جلال کے پڑپوتے میر سید علی کو علم ہوا تو وہ سبزوار سے بزمانہ شاہ بہلول لودھی (۸۶۰ھ مطابق ۱۴۵۵ء) دہلی تشریف لائے اور بہلول لودھی سے ملاقات کر کے تمام حالات بیان کئے۔ اپنا شجرۂ نسب اور تعلق ثابت کیا۔ شاہ بہلول نے اطمینان حاصل کرنے کے بعد جارچہ کی آباد زمین اور اس کے متعلقات کی وہ تمام زمین ان کو

دی تھی جو مبارک شاہ خلجی بادشاہ دہلی نے سید میر حسن کو دے دیئے تھے۔ آپ نے جارچہ کو از سرِ نو آباد کیا

جب یہ خبر میر سید حسن کے پوتوں کو پہنچی تو ان میں سے تین یعنی سید محمود، حجی بن سید ناصر، میر مہران

کے فرزند اور بندگی معظم کے بیٹے "زین خان" میر سید علی کے پاس جارچہ آئے اور ان سے دوبارہ

یہاں آباد ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ ساتھ ہی اپنی ملکیت کا دعویٰ بھی کیا۔ یہ مسئلہ دوبارہ تنازع کا

سبب بن سکتا تھا لیکن میر سید علی نے اس سے گریز کیا اور ان تینوں کو اپنے ساتھ لے کر بہلول لودھی

سے ملنے گئے اور تصفیہ طلب مسئلہ شاہ دہلی کی صوابدید پر منحصر کر دیا۔ شاہ بہلول نے ان

لوگوں کی تقسیم پر رضامند پا کر کل اراضی چار حصوں میں تقسیم کر دی اور یوں دوسری بار ان چار

خاندانوں سے جارچہ آباد ہوا اور ان کی اولاد آئندہ سادات جارچہ کہلائی۔

مزید حالات، معلومات اور تفصیلات کے لئے

دوسرا حصہ ملاحظہ فرمایئے